سہ ماہی
کاروانِ ادب
لکھنؤ
مرکزی دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی)
شعبۂ برصغیر، لکھنؤ (انڈیا)

سہ ماہی

کاروان ادب

جلد نمبر-۲۷ | جولائی-اگست-ستمبر ۲۰۲۰ | شمارہ نمبر-۲

مجلس مشاورت

• مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی • مولانا حافظ فضل الرحیم • ڈاکٹر محمود الحسن عارف • مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مشرف عام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صدر رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر

مدیر تحریر

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی

نائب مدیر

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

معاون تحریر : مولانا نذر الحفیظ ندوی

مجلس ادارت

• ڈاکٹر شفیق احمد ندوی، دہلی • ڈاکٹر تابش مہدی، دہلی • ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ • مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی، بھٹکل

معاون انتظامی اقبال احمد ندوی

-: زرتعاون :-

اس شمارہ کی قیمت: ۵۰ روپے، سالانہ برائے ہندوستان ۲۰۰ روپے پاکستان و بنگلہ دیش: ۳۰۰ روپے یا ۱۰ امریکی ڈالر ان کے علاوہ دیگر ممالک: ۴۰۰ روپے

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں

RABITA-AL-ADAB-AL-ISLAMI(INDIA)

-: صدر دفتر :- رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

Designed & Printed at : Mashhud Enterprises Lko. Mob. 9839133588, 9451947786

اس شمارے میں

ابتدائیہ: زبان انسان کے لیے بڑی نعمت	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۳
اداریہ: مخطوطات۔ترس رہے ہیں کسی مردِ کارداں کے لیے	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۵
حمد	سید ریاض حسین زیدی	۸
نعت شریف	عاصی کرنالی	۹
مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی زندگی کے تشکیلی عناصر	ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی	۱۰
عربی کے مشہور ادیب احمد امین کی خودنوشت سوانح ''حیاتی''	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۹
علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی نظموں میں ملت کی دردمندی کا تذکرہ	اقبال احمد ندوی	۲۳
ادبِ اطفال میں قصوں اور کہانیوں کی اہمیت اور حکیم شرافت حسینؒ کی کاوشیں	سید ضیاء الحسن	۳۲
بچوں کے لیے حکیم شرافت حسین رحیم آبادیؒ کی پیاری کتاب ''حضرت عمرؓ''	ڈاکٹر غیاث الدین ندوی	۴۰
ایک دلنواز شخصیت.....ایک باوقار فنکار ظہیر الدین ظہیرؔ رانی بنوری	عزیز بلگامی	۴۶
دکن میں اردو کا آغاز وارتقا	محمد شاداب خان	۵۱
اردو زبان وادب کے ارتقا میں دکن کا حصہ	محمد مسعود عزیزی ندوی	۵۸
تعارفِ کتاب.....فضیل ناصری کا مجموعہ کلام ''آؤ کہ لہو رولیں''	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۶۷
شمشیر گمشدہ.....اقبال کی نایاب تاریخی نظم	ڈاکٹر رؤف خیر	۷۴
افسانہ : تحریک	جیلانی بی اے	۷۵
غزل	قدیرؔ شیدائی	۸۰

ابتدائیہ

ادب کا اسلامی تصور

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صدر رابطہ ادبِ اسلامی

ادب کا دائرہ بھی اپنے میں حسبِ ضرورت وسعت اور تنوع رکھتا ہے اور تمدنی زندگی کے دائرے میں تو اس کا تنوع مزید بڑھ جاتا ہے۔ لیکن یہ تنوع کبھی کبھی ایک دوسرے سے دوری پیدا کرتا ہے۔ یہ فرق بعض وقت افادیت رکھتا ہے اور بعض وقت مضرت کا حامل ہوتا ہے۔

ادب میں جو کشش ہوتی ہے وہ اپنے قارئین کو اس کی طرف مائل کر کے نفع وضرر کا حامل بناتی ہے۔ یہی کشش ہے جو بعض وقت ذہنی رجحانات پر اثر ڈالتی ہے اور ادیب کا ہم رائے بنا دیتی ہے۔

کامیاب ادیبوں کو علیحدہ علیحدہ دیکھیں تو ان کی کارگزاری کی اپنی اپنی خصوصیات ملیں گی۔ اردو ادب میں علامہ شبلی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولانا آزاد، اکبر الہ آبادی اور خواجہ الطاف حسین حالی تقریباً ایک ہی عہد کے ادبا ہیں۔ انھوں نے اس عہد کے بے مثال ادیب ہونے کے ساتھ اپنی سوسائٹی کو اعلیٰ رجحانات دیئے جو اس ملک کے مسلمانوں کے لیے سنگِ راہ کا کام انجام دیتے ہیں۔

مگر ان کا مذکورہ بالا عہد ختم ہونے پر جو عہد آیا اس میں اس طرز کے ادیبوں کی کمی پیش آنے لگی اور اردو کے اصل مرکز شمالی ہند میں مقامی اثرات کی بنا پر زبانوں کی ملاوٹ سے اردو ادب کی کارگزاری کمزور ہوگئی۔ اور ایک دوسرا نقصان یہ سامنے آیا کہ مغربی تعلیم وثقافت کا اثر غالب ہونے پر ادب کا دین سے تعلق کمزور ہوگیا۔ دین وادب کو الگ الگ سمجھا گیا اور یہ خیال عام طور پر ان لوگوں میں اثر انداز ہوا جو دینِ اسلام کے دائرے کو صرف عبادات تک محدود سمجھتے ہیں اور دینی زندگی کے ذہنی اور قلبی پہلوؤں کا دین میں جو حصہ ہے وہ ان سے مخفی ہے یا وہ دین کو ناپسند کرتے ہوئے ادب کو اس سے الگ رکھنا پسند کرتے ہیں۔ ادب کے علم برداروں میں یہ رجحان پیدا ہو کر مسلمانوں کی نئی نسلوں کے لیے نقصان دہ ہونے کو محسوس کر کے ادبِ اسلامی کی اصطلاح کی ضرورت محسوس کی گئی جو اولاً بہت اجنبی اصطلاح محسوس کی گئی اور سمجھا گیا کہ اس کے داعی ادب کو عبادات اور وعظ ونصیحت کے دائرے میں قید کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت پڑی کہ اصطلاح کا سہارا لیکر اس بات کو واضح کیا جائے کہ اسلامی زندگی میں بھی پورا ضروری تنوع اور توسع رکھا گیا ہے۔ اس کو بھی اس کا ادبی حق ملنا چاہئے۔

یہ کوشش الحمد للہ سودمند ہو رہی ہے۔ ادبِ اسلامی کی اصطلاح اب اجنبی یا غیر عملی اصطلاح نہیں رہی۔ ہمارا رابطہ ادبِ اسلامی ادب کا جو حق ہے وہ دینے کے لیے کوشاں اور ترجمان ہے۔ اور اس کی اس کوشش کو اب پسند کیا جا رہا ہے اور اس کے موضوع کے تحت سیمینار اور پروگرام ہو رہے ہیں۔ ☆☆☆

اداریہ

مجتبیٰ حسین مرحوم کی شگفتہ نگاری

دریائے لطافت کی موجیں

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

مجتبیٰ حسین ہندوستان کے بہت بڑے مزاح نگار تھے۔ مزاح نگاری اور ظرافت ادب کی ایک قسم ہے اور اس کی اہمیت قرآن وحدیث سے بھی ثابت کی جاسکتی ہے۔ قرآن مجید میں کافروں کے بارے میں ہے ﴿فبشرھم بعذاب أليم﴾ یعنی انہیں عذابِ الیم کی بشارت دے دو۔ عذاب کے لیے بشارت کے لفظ کا استعمال ایسا ہے جس میں طنز وتعریض اور ظرافت کا عنصر موجود ہے۔ سیرت میں بہت سے واقعات موجود ہیں جن سے آپ (ﷺ) کی لطافتِ ذوق کا اور آپ کی شگفتہ مزاجی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کا ۲۷ مئی ۲۰۲۰ کو حیدرآباد میں عید کے دو دن کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کے ایک قریبی واقف کار نے ان کے بارے میں مضمون لکھا کہ وہ روزانہ پابندی کے ساتھ صبح کے وقت غسل کرتے اور پھر دو رکعت نفل نماز پڑھتے تھے۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے۔ مجتبیٰ حسین بہت بڑے ادیب اور فنکار تھے اور مزاحیہ نگار تھے۔ ان کے فکر وفن پڑ لکھنے والے بڑے بڑے استاد اور نقاد ملک میں موجود ہیں جن کی تحریریں صفحۂ قرطاس پر سامنے آتی رہی ہیں اور آتی رہیں گی۔ ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک مضمون ایسا ہو جس میں کسی فلسیانہ تحریر وتقریر اور کسی ناقدانہ شرح نویسی اور کسی حاشیہ آرائی اور کسی نکتہ سنجی کے وسیلے کے بغیر مجتبیٰ حسین کے فن کو بلا واسطہ پیش کر دیا گیا ہو۔ چنانچہ ان کے بارے میں اظہارِ غم کرتے ہوئے ان کے چند اقتباسات دریائے لطافت کی چند موجوں کے نام سے جمع کر دئے گیے ہیں جو ایک باذوق قاری کے محظوظ ہونے اور لطف وانبساط کے لیے کافی ہیں۔

(۱)

''ان کی تصویر دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے آپ جزیرہ نمائے عرب کے نقشے کو دیکھ رہے ہیں، بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اس میں کہیں کہیں عرب کا صحراء بھی صاف دیکھائی دیتا تھا۔ بالکل سپاٹ چٹانی اور کرخت صحراء۔ ڈاڑھی کے بغیر ان کا چہرہ عرب کے جغرافیہ سے قریب تھا اور اب ڈاڑھی کے بعد عرب کی تاریخ وتمدن سے قریب ہوگیا ہے، اور تاریخ وتمدن کی کیوں کہ جغرافیے سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے اس لیے ان کا چہرہ اب قابلِ قبول سا بن گیا ہے۔'' (عمیق حنفی کے بارے میں)

(۲)

''دوستو! یہ ٹفن کا باکس کتے کے منہ سے چھینو۔ یہ

میری عزت کا سوال ہے۔ اگر کتے نے اس ٹفن باکس کو کھول لیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ آج تک دفتر میں کسی کو یہ پتہ نہیں ہے کہ میں سالن کے بغیر ہی ایک چپاتی ٹفن باکس میں ڈال کر لاتا ہوں۔ پھر یہ اکلوتی چپاتی بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے ڈائریکٹر صاحب کا کتا بھی کھا سکے۔'' (ڈائریکٹر کا کتا)

(۳)

''ایک بار کا ذکر ہے کہ ہم ایک ڈاکٹر کے پاس پہونچے تو حسبِ دستور گھوڑے پر سوار تھے، ہمارے جاتے ہی انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ہمارے منہ میں تھرمامیٹر ٹھونس دیا، نبض دیکھی، آنکھیں چیر کر دیکھ ڈالیں، جبڑوں کے نیچے غدود کو ٹٹولتے رہے، گردن کو جھٹکے دے دے کر ہلایا، بال پکڑ کر نوچ ڈالے، منہ پر چپت رسید کیا، پھر گوشمالی کرنے لگے، اور ہم ان ساری حرکتوں کے جواب میں تھرمامیٹر کو منھ میں پکڑے نہایت سعادت مندی کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھے رہے، پھر ڈاکٹر صاحب کے جی میں جانے کیا آئی کہ انھوں نے اچانک ہماری آستین اوپر چڑھائی، اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ انجکشن کی سرنج ہمارے ہاتھ میں دھنسا دی، ہم درد کے مارے مچل اٹھے۔ ہمارے منھ سے تھرمامیٹر گر پڑا اور ہم چیخنے لگے، اس پر ڈاکٹر صاحب نے غصے میں کہا: ''میاں چپ رہو، کیا چھوٹے بچے ہو جو انجکشن کا درد بھی برداشت نہیں کر سکتے''۔ اس پر ہم نے ڈاکٹر صاحب کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ''مگر ڈاکٹر صاحب میری بات تو سنیں، اصل میں میں بیمار نہیں ہوں بلکہ میں تو اپنے ماموں کے مرض کی کیفیت بیان کرنے آیا ہوں''۔ (ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے ڈاکٹروں کے)

(۴)

''پہلی نظر میں تو میں اس لڑکی پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا، لیکن دوسری نظر میں اس پر بمشکل پانچ سو جان سے عاشق ہو سکا''۔

(۵)

''ادب میں اتنے تجربے کیے گیے کہ ادب لیبارٹری میں تبدیل ہو گیا ہے، ہر ادیب نے ادب کو ایک نیا موڑ دینا چاہا، چنانچہ ہمارا ادب اتنا مڑا تڑا ہو گیا ہے کہ اسے دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ برسوں بعد کسی گھڑے میں سے نکالی ہوئی شیروانی کو دیکھ رہا ہوں''۔ (اردو کا آخری قاری)

(۶)

''اگر آپ ایک بار فون کر لیں تو پولیس زیادہ سے زیادہ تین منٹ تیئس سکنڈ کے اندر مقام واردات پر پہونچ جاتی ہے، ہماری پولس کی طرح نہیں کہ فون کرنے کے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد سیٹیاں بجاتی ہوئی چلی آتی ہے، ہماری پولس امن کم قائم کرتی ہے، اور سیٹیاں زیادہ بجاتی ہے''۔ (جاپان چلو)

(۷)

''اب لوگوں کو ان کی تقریر زبانی یاد ہو چکی، اردو

زبان کی مٹھاس اور چاشنی پر وہ جان دیتے ہیں، چونکہ ساری اردو شاعری کو وہ حلوائی کی دکان سمجھتے ہیں، اسی لیے تو انھیں مشاعروں میں پابندی سے بلایا جاتا ہے''۔(ایک مشاعرے کی رننگ کامنٹری)

(۸)

''ٹرین جب ہچکولے کھاتے ہوئے آگے بڑھتی ہے، تو ہم اپنے سامان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہیں، اور کتاب کھول کر برتھ پر دراز ہوجاتے ہیں، تھوڑی دیر تک تو کتاب اور ٹرین دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں، مگر اس کے بعد ہماری نظروں کے سامنے کتاب کی سطریں بڑی تیزی سے پٹریاں بدلنے لگتی ہیں، اور اس کے بعد نہ جانے کب ہماری آنکھیں خود بہ خود بند ہوجاتی ہیں، پر کتاب ہمارے سینے پر سوار ہوجاتی ہے، جیسے وہ خود ہمارا مطالعہ کر رہی ہو۔اچانک ایک جھٹکے سے ہماری نیند اچٹ جاتی ہے، ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں، ہمارا ہاتھ اپنے سینے پر کتاب کو تلاش کرنے لگتا ہے، مگر کتاب وہاں نہیں ہوتی۔ یہ کتاب ہمیں اپنے پاس والی برتھ کے مسافر کے سینے پر نظر آتی ہے۔تب ہم اپنی کتاب کو پڑوسی مسافر کے سینے پر سے بڑی آہستگی کے ساتھ یوں اٹھاتے ہیں جیسے ہم اس کتاب کی چوری کر رہے ہوں۔ پھر یہ کتاب ہمارے سینے پر دراز ہوجاتی ہے، جب ہم دوبارہ جاگتے ہیں تو پھر اس کتاب کو اپنے پڑوسی مسافر کے سینے پر پاتے ہیں اور یہ سلسلہ منزلِ مقصود کے آنے تک جاری رہتا ہے۔کتاب کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی جائے۔درمیان میں جب بھی ہماری آنکھ کھلتی تو اپنی کتاب کو کسی نئے مسافر کے سینے پر پاتے ہیں۔پھر ایک موقع ایسا بھی آتا ہے جب ہماری کتاب اچانک ٹرین سے غائب ہوجاتی ہے، ہم اسے ڈبے سے لے کر باتھ روم تک میں تلاش کرتے ہیں، مگر وہ ہمیں داغِ مفارقت دے جاتی ہے۔ ہم سینے پر کتاب رکھنے کے بجائے پتھر رکھ دیتے ہیں''۔(ٹرین میں پڑھنا)

(۹)

''ہم نے عید سے ایک دن پہلے ایک گوالے کو دیکھا، جو بالٹیوں میں پانی بھر کر لے جا رہا تھا، ہم نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ بولا: جی کچھ نہیں ذرا عید کی تیاری ہو رہی ہے''۔(عید کی تیاری)

(۱۰)

''پچیس چھبیس برس ادھر کی بات ہے، مخدوم محی الدین ''انڈر گراؤنڈ'' تھے، اور میں مڈل اسکول کا طالب علم تھا، ان دنوں مجھے اتنی ہی انگریزی اردو آتی تھی جتنی کہ آج آتی ہے، لہذا میں انڈر گراؤنڈ کا آسان ترجمہ ''زیرِ زمین'' کر کے گھنٹوں حیران رہا کرتا تھا کہ مخدوم بھائی آخر زیرِ زمین رہ کر کیا کرتے ہیں، مجھے تو یکے از معدنیات کی قسم کی کوئی چیز لگتے تھے۔

'' جن دنوں بنے بھائی یعنی سجاد ظہیر پاکستان میں پارٹی کی سرگرمیوں کے سلسلے میں روپوش تھے،

تاجکستان کے مشہور شاعر مرزا ترسوم زادہ پاکستان کے دورے پر آئے ، اور ایک پاکستانی شاعر سے فارسی میں پوچھا ''سجاد ظہیر کجا است؟''، پاکستانی شاعر نے بڑی روانی کے ساتھ فارسی میں ترکی بہ ترکی جواب دیا: ''سجاد ظہیر زیر زمین است''، یہ سنتے ہی مرزا ترسوم زادہ کی آنکھوں میں کم وبیش اتنے ہی روانی کے ساتھ آنسو آ گئے ، بولے :''یہ کب ہوا؟۔ہمیں تو کچھ بھی پتہ نہ چلا، آخر انھیں کیا بیماری تھی؟''۔۔۔مخدوم کے جنازے میں ہزاروں لوگ دھاڑے مار کر رونے لگے تھے مگر اس بار وہ زیرِ زمین جاتے ہوئے اپنے ساتھ کچھ نہیں لے گیے۔''(مخدوم محی الدین)

(۱۱)

''سیاست دانوں کو یہ آزادی ملی ہوئی ہے کہ وہ جتنی چاہیں پارٹیاں بدلیں ، جب جی چاہے اپنے نظریات بدل دیں۔یہی وجہ ہے کہ سیاسی پارٹیوں کی حیثیت ٹی پارٹیوں کی سی ہوگئی ہے، کہ چائے پی لی اور دوسری پارٹیوں کی طرف چلے گیے ،بعض لیڈروں کو تو اب یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ آزادی کے بعد کتنی پارٹیاں بدل چکے ہیں،ایک زمانے میں لیڈر کسی پارٹی میں شامل ہوتا تھا،تو اس پارٹی کے کارکن کی حیثیت سے ہی اس کا جنازہ اٹھتا تھا۔اب لیڈر کے جنازے کو کندھا دینے والے ایک ہی پارٹی کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ مخلوط جنازے ہوتے ہیں''۔(یوم آزادی)

(۱۲)

''کنہیالال کپور کو جب بھی دیکھتا ہوں قطب مینار کی یاد آتی ہے، مجھے فرق یہ نظر آیا کہ قطب مینار پر رات کے وقت ایک لال بتی جلتی ہے تاکہ ہوائی جہاز وغیرہ ادھر کا رخ نہ کریں، کپور صاحب پر رات کے وقت یہ حفاظتی انتظام نہیں ہوتا جو خطرے سے خالی نہیں۔کیا پتہ کسی دن رات کے وقت کوئی ہوائی جہاز اندھیرے میں کپور صاحب سے نبرد آزما ہو جائے اور ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔'' (آدمی نامہ۔کنھیا لال کپور کی دراز قامتی کے بارے میں)

(۱۳)

'' غالب اکیڈمی کا شہرہ سن کر خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق پچھلے دنوں میرے پاس آئے تھے، مجھ پر چوٹ کرنا چاہتے تھے سو فرمانے لگے'' غالب اکیڈمی پر اتنا نہ اتراؤ، میرے پرستاروں نے بھی جہان فانی میں میرے نام پر ایک ادارہ قائم کیا ہے نام اس ادارے کا ''حلقۂ ارباب ذوق'' بتاتے تھے۔ '' (غالب اکیڈمی)

(۱۴)

''مجتبیٰ حسین (جنہیں مرحوم کہنے کے لیے کلیجہ منہ کو آنا چاہئے مگر جانے کیوں نہیں آ رہا) پرسوں اس دنیا سے رخصت ہو گیے ، یہ ان کے مرنے کے دن نہیں تھے کیونکہ انہیں تو بہت پہلے نہ صرف مر جانا بلکہ ڈوب مرنا چاہئے تھا۔''

☆☆☆☆☆☆☆

حمد

اعترافِ بندگی

ڈاکٹر عطیہ خلیل عرب

تو ایک ہی لاریب ہے تیرے سوا کوئی نہیں
ہر شے فنا، تو ہے بقا، تیرے سوا کوئی نہیں

صبحِ ازل کی ابتدا، شامِ ابد کی انتہا
کوئی نہیں تیرے سوا، تیرے سوا کوئی نہیں

باطن بھی تو ظاہر بھی تو اول بھی تو آخر بھی تو
اور چار سو جلوہ نما تیرے سوا کوئی نہیں

امت ترے محبوب کی معتوب ہے مقہور ہے
اس کا یہاں درد آشنا تیرے سوا کوئی نہیں

ہم سب ترے محتاج ہیں، تو ہے غنی یا ذوالمنن !
مشکل کشا ' حاجت روا، تیرے سوا کوئی نہیں

نعت شریف

حکیم شریف احسن

شریعت کا یہی دل ہے' طریقت کی یہی جاں ہے
محبت سرورِ کون و مکاں کی اصل ایماں ہے

یہ رعنائی' یہ زیبائی جہاں میں ان کے ساتھ آئی
محبت' روشنی' عدل و وفا سب ان کا احساں ہے

وہ اونٹوں کی قطاروں کی قطاریں بخش دیتے ہیں
صداقت کی کہاوت حاتمِ طے ان کا درباں ہے

شتربانوں کو سکھلائے وہ آدابِ جہاں بانی
زمانہ آج تک ان کی جہاں بانی پہ حیراں ہے

چٹائی' چارپائی' پھوس کی چھت' کچی دیواریں
جہانِ عیش و عشرت میں یہی کچھ ان کا ساماں ہے

جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں' آساں ہو کہ مشکل ہو
جہاں دیکھا گیا ان کو وہی تصویرِ قرآں ہے

رہا تھا فرق کچھ باقی نہ انساں اور حیواں میں
یہ ان کی درس گہ کا فیض ہے' انسان انساں ہے

جہاں آرا جہاں ان کا نہیں دیکھا تو کیا دیکھا
ان آنکھوں سے انھیں دیکھوں' یہی اک جی کا ارماں ہے

بجھا سکتی نہیں ہیں آندھیاں اس شمع کو احسنؔ
جو میرے دل کے فانوسِ محبت میں فروزاں ہے

عالم گیر تاریکی میں ہدایت کا عالم گیر پیغام
قرآن کریم کے ہدایتی اسلوب اور وجوہِ بلاغت کی روشنی میں

مولانا افتخار احمد قاسمی بستوی
جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب قرآن مجید کو قیامت تک کے انسان وجنات کی کامل ہدایت وبہبودی کے لیے، اپنے آخری نبی، فخرِ کائنات، سرکارِ دوعالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ۲۳ رسال کے طویل عرصے میں، افضل الملائکہ حضرت جبرئیلِ امین علیہ السلام کے واسطے سے، قلیل وکثیر مقدار میں دعوت وارشاد کے سب سے انوکھے اسلوب میں نازل فرمایا۔

پورے قرآن کریم کی ۶۶۶۶ آیات کریمہ کو نازل کرنے کا دو ہی طریقہ کار رہا ہے، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے از خود حالات ومقتضیات کے پس منظر میں، بندگانِ خدا کی اصلاح وتعمیر کے لیے اور ان کو تاریکی سے نکال کر روشنی وعزت کے مقام پر پہنچانے کے لیے آیات وسورتیں نازل فرمائیں۔ دوسرے یہ کہ ایسے واقعات وحوادث اور ضروریات، معاشرۂ انسانی میں پیش آئیں جو مشاہداتی شکل میں آیات وہدایاتِ ربانی کی منتظر تھیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتے کو بھیج کر آیاتِ قرآن کا نزول فرمایا۔

''علوم القرآن'' کے مصنف مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

''قرآن کریم کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے از خود نازل فرمائیں کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ ان کے نزول کا سبب نہیں بنا، دوسری آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول کسی خاص واقعے کی وجہ سے یا کسی سوال کے جواب میں ہوا، جسے ان آیتوں کا پس منظر کہنا چاہیے''۔

(علوم القرآن: از مفتی تقی عثمانی: ۷۲)

قرآن کریم ایک ایسی ابدی اور سرمدی کتاب ہے جو کائنات کی ہدایت ودستگیری اور انسانوں کی رہنمائی کے لیے اتاری گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم کے دوسرے پارہ سورۂ بقرہ رکوع نمبر ۷/ آیت نمبر ۱۸۵/ میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ (البقرہ: ۱۸۵)

اس کتاب کی ہدایت ورہنمائی کا دائرہ جس قدر وسیع ہے، اسی طرح اس کے نزول سے پیشتر دنیا میں ضلالت وگمراہی کا دائرہ وسیع تھا اور گمراہی وضلالت صرف بڑے پیمانے پر ہی پھیلی نہیں تھی بل کہ اس کی جڑیں بڑی گہری، مضبوط اور پہلو دار تھیں، بے راہ روی کی پرتیں اتنی زیادہ ایک دوسرے سے جڑی، چپکی اور مربوط تھیں کہ ان کا قلع قمع کرنے اور باطل کو مٹانے کے لیے ہدایت کی روشنی اور رہنمائی کا اسلوب اتنا پر اثر، انوکھا، دلوں کو موہ لینے والا اور واضح ہونا چاہیے تھا کہ دل وزبان متحد ہو کر داعی کی دعوت اور ہادی کی ہدایت کی صدا پر لبیک کہہ اٹھے، قرآن کریم نے اسی بات کو یوں بیان کیا ہے:

"لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۰ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۰ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۰ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۰ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۰ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ" ۔(پ۳۰، بینہ)

ہدایتِ قرآنی کا اسلوب

ہدایتِ قرآنی کا اسلوب، عقائد، احکام، قصص وامثال کی روشنی میں اتنا مضبوط ہونا ہی چاہئے تھا، جتنا مضبوط وگہرا انسانی معاشرہ کا کفروشرک اور نفاق وضلال تھا، انسانی سماج کی گمراہی ایسی گھٹاٹوپ اور تاریک ترین وادی میں بناہ گزیں تھی کہ اس کو نکال باہر کرنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور آپ پر نازل ہونے والے قرآنِ کریم کے کلام کی پراثر ہدایت کے ذریعے ہی ممکن تھا، ہدایتِ قرآنی کا مؤثر انداز صحیح حدتک سمجھنے کے لیے، نزولِ قرانی کے وقت کائنات کی گمراہی کا کچھ حال اگر پیش نظر رہے تو بات واشگاف طور پر سمجھ میں آسکتی ہے۔مفکرِ اسلام حضرت مولانا سیدابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۹ء) قرآنِ کریم کے نزول سے قبل کے حالات پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"چھٹی صدی مسیحی بلا اختلاف تاریخِ انسانی کا تاریک ترین وپست ترین دور تھا، صدیوں سے انسانیت جس پستی ونشیب کی طرف جارہی تھی، اس کے آخری نقطے کی طرف پہونچ گئی تھی، روئے زمین پر اس وقت کوئی ایسی طاقت نہیں تھی، جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے، اور ہلاکت کے غار میں اس کو گرنے سے روک سکے، نشیب کی طرف جاتے ہوئے روز بروز اس کی رفتار میں تیزی پیدا ہورہی تھی، انسان اس صدی میں خدا فراموش ہوکر کامل طور پر خود فراموش بن چکا تھا۔..... پیغمبروں کی دعوت کی آواز عرصہ ہوا دب چکی تھی، جن چراغوں کو یہ حضرات روشن کرگیے تھے، وہ ہواؤں کے طوفان میں یا تو بجھ چکے تھے، یا شہروں کو چھوڑ کر چند پورے پورے گھروں کو بھی اجالا نہیں کرسکتے تھے۔..... رومی وایرانی اس وقت مغرب ومشرق کی زعامت اور دنیا کی قیادت کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے، وہ دنیا کے لیے کوئی اچھا نمونہ ہونے کے بجائے ہر قسم کی خرابی اور فساد کے علم بردار وذمے دار تھے، مختلف اخلاقی امراض کا عرصے سے یہ قومیں آشیانہ بنی ہوئی تھیں، ان کے افراد تعیش وتکلّفات کی زندگی اور مصنوعی تمدن کے سمندر میں سرتاپا غرق تھے، بادشاہ اور حکام خوابِ غفلت میں مدہوش اور نشۂ سلطنت میں سرشار تھے، کام ودہن کی لذت اور خواہشاتِ نفس کی تسکین کے سوا ان کو دنیا میں کوئی فکر اور زندگی میں کوئی اور مشغلہ نہ تھا، زندگی کی ہوس اور لذت کی حرص اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کو کسی طرح سیری نہیں ہوتی تھی، متوسط طبقے کے لوگ (ہر زمانے کے دستور کے مطابق) اس اعلیٰ طبقے کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کی نقالی کو سب سے بڑا فخر سمجھتے تھے۔ باقی رہے عوام تو وہ زندگی کے بوجھ اور حکومت کے مطالبات اور محصولات کے بار میں ایسے دبے ہوئے، اور اخلاقی اور قانون کی زنجیروں اور

بیڑیوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ ان کی زندگی جانوروں اور چوپایوں سے ذرا مختلف تھی، دوسروں کی راحت کے لیے محنت کرنے اور عیش وعشرت کے لیے بے زبان جانوروں کی طرح ہر وقت جتے رہنے اور جانوروں کی طرح اپنا پیٹ بھر لینے کے سوا ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔''

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر:۳۲)

ظاہر سی بات ہے کہ اتنی سنگین صورتِ حال میں گمراہی سے ہدایت کی طرف لانے، تاریکی سے روشنی کی چاشنی کی لذت سے بہرہ اندوز ہونے اور سیرت وکردار کے فساد سے اخلاق وکردار کے کمال تک پہنچانے کے لیے کلامِ ربانی کے ہدایتی اسلوب کا نقشہ کچھ ایسا دلربا، دلکش اور باطنی وظاہری اتحاد کی رعنائی سے متصف ہونا چاہئے تھا جس کی قرآن نے: ﴿ ''حَتّٰی تَاْتِیَهُمُ الْبَیِّنَةُ ۝ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً'' ﴾ سے تصریح فرمائی ہے۔

ایسی دینی غفلت، خودفراموشی، اجتماعی بے نظمی، انتشار وفساد اور اخلاقی تنزل وزوال کے عالم میں اگر آپ اقوامِ عالم کے مذاہب واحوال پر نظر ڈالیں، ساتھ ساتھ قرآنِ کریم کے ہدایتی اسلوب کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ اندازہ لگانا بالکل آسان ہوگا کہ عقائد واحکام اور قصص وامثال سے متعلق بے شمار آیاتِ قرآنی نے بندوں کی ہدایت کے لیے ایسا نادر اسلوبِ تعبیر وبیان کو اختیار کیا ہے جس کی تہ تک پہونچنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔

پورے عالم کو ھدایتِ قرآنی ضرورت

جس دور میں بعثتِ محمدی ہونے والی تھی اور قرآنی ہدایت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے والی تھی، اس وقت کی اقوام اور اس دور کے مذاہب پر ایک طائرانہ نظر ہی ڈالتے چلیں تاکہ اندازہ ہوسکے کہ قرآنِ کریم کے کلام میں ہدایت کا اسلوب کتنا پختہ، دوررس، عمیق اور پہلودار ہے اور قرآنِ کریم نے اقوام وملل کی ہدایت ورہنمائی کے لیے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کے علاوہ نہ کوئی اسلوب کارگر ہوسکتا تھا اور نہ کوئی قدیم و جدید کتاب۔ مفکرِ اسلام مولانا علی میاں ندویؒ رقم طراز ہیں:

''اس دور میں بڑے بڑے مذاہب بازیچۂ اطفال اور منافقین کا تختۂ مشق بن گیے تھے، ان مذاہب کی حقیقت وصورت دونوں اس درجے مسخ ہوگئی تھی کہ اگر یہ ممکن ہوتا کہ کسی طرح ان مذاہب کے پیشوا دنیا میں آکر اپنے دین کا حال دیکھ سکیں تو قطعاً وہ اپنے مذاہب نہ پہچان سکتے''۔

''تہذیب وتمدن کے گہواروں میں خودسری، بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دور دورہ تھا، نظامِ حکومت میں حد درجے ابتری تھی، حکام کی سخت گیری اور عوام کی اخلاقی گراوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قومیں اپنے اندرونی مسائل ہی میں الجھ کر رہ گئی تھیں، دنیا میں پیش کرنے کے لیے، ان کے پاس نہ کوئی پیغام تھا اور نہ انسانیت کے لیے کوئی دعوت تھی، درحقیقت یہ اقوام و مذاہب اندر سے کھوکھلے ہوچکے تھے، ان کی زندگی کا سوتا خشک ہوچکا تھا، ان کے پاس نہ دینی ہدایات تھیں اور نہ نظامِ حکومت کے لیے مستحکم ومعقول اصول''۔

عیسائیت کو بھی ہدایتِ قرآنی کی احتیاج

مسیحیت یا عیسائیت جسے عیسیٰ علیہ السلام نے مسیحی مذہب کی شکل میں روئے گیتی پر بحکم خداوندی برپا کیا تھا اور اس

کی آسمانی کتابوں میں،، ہدایتِ قرآنی،، اور،، بعثتِ محمدی،، کی بشارت صاف ورواں لفظوں موجود تھی ،لیکن اس کا بھی تقریبا شیرازہ بکھر چکا تھا، اس حد تک اس کے پاس بھی تفصیل و وضاحت نہ تھی جس کی روشنی میں زندگی کے بکھرے خطوط درست ہوسکیں، اہم مسائل سلجھ سکیں اور اس کی اساس پر معتبر تمدن کی تعمیر کی گاڑی چل سکے یا اس کی ہدایت ورہنمائی میں سلطنت کو چلایا جا سکے، ہاں حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات وارشادات کا نہایت ہلکا اور ایک دھندلا سا خاکہ تھا جس پر خالص توحید کے سادے عقیدے کا پرتو ضرور تھا، اور یہ مسیحیت اسی ہلکی سی سادگی وسچائی کے ساتھ اس وقت تک قائم وباقی رہی جب تک یہ مذہب سینٹ پال کی قطع وبرید سے محفوظ رہا۔

مفکرِ اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

’’اس نے تو آکر رہی سہی روشنی بھی گل کردی کیوں جس پرستانہ ماحول میں اس کی پرستش ہوئی تھی اور جن جاہلی خرافات سے وہ نکل کر آیا تھا اس نے مسیحیت میں ان تمام جہالتوں اور لغویات کی آمیزش کردی، اس کے بعد قسطنطین کا زمانہ آیا جس نے اپنے دورِ حکومت میں رہی سہی اصلیت بھی کھودی‘ غرض یہ کہ چوتھی صدی ہی میں مسیحیت ایک معجونِ مرکب بن کر رہ گئی تھی ،جس میں یونانی خرافات، رومی بت پرستی ، مصری افلاطونیت، NEW-PLATONISM & MONAS اور رہبانیت کے اجزا شامل تھے، حضرت مسیح علیہ السلام کی سادہ تعلیمات کا عنصر اس مجموعے میں گم ہوکر رہ گیا تھا، جیسے کہ ایک قطرے کا وجود سمندر میں گم ہوجاتا ہے‘‘۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر:۳۴)

جس توریت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اللہ نے کتابِ ہدایت بنا کر اتارا تھا اور اس میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف لفظوں میں بشارت اور قرآنی ہدایت کا کھلا پیغام تھا اس کے ساتھ مسیحیت پرستوں یا مخالفوں نے کیسا سوتیلا برتاؤ کیا! اس کا قدرے اجمالی خاکہ مذکورہ بالا سطروں میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

رومی سلطنت کا حال زار

’’قرآنِ قریم کے کلام میں ہدایتِ ربانی کا اسلوب اسی وقت نمایاں طور پر سامنے آسکتا ہے جب نزولِ قرآن کے وقت یا اس کے قدرے پہلے کے احوال وکوائف اور مختلف سلطنتوں کا حالِ زار قدرے تفصیل یا مختصر معلوم ہو ’’سیل‘‘ Sale جس نے قرآن کریم کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اس نے چھٹی صدی عیسوی کے عیسائیوں کا حالِ زار یوں بیان کیا ہے، مسیحیوں نے بزرگوں اور حضرت مسیح کے مجسموں کی پرستش میں اس درجے غلو کیا کہ اس زمانے کے رومن کھیتولک بھی اس حدتک نہیں پہنچ سکے‘‘۔

SALES TRANSLATION: P62)

بحوالہ انسانی دنیا:۳٦)

اسی حوالے سے رومی سلطنت میں مذہبی خانہ جنگی بھی ملاحظہ کرتے چلیں کہ اسی زمانے میں مذہب سے متعلق کلامی بحثوں کا بازار گرم ہوا، بے مقصد و بے نتیجہ اختلاف کی یورش

وشورش نے پوری قوم کو الجھا کر مردہ بنا دیا، اسی میں ان کی ذہانتیں جواب دینے لگیں اور عملی طاقتیں شل ہوگئیں، بیشتر ان خانہ جنگیوں نے بڑے پیمانے پر خونی معرکہ کی شکل اختیار کر لی، مدرس، کلیسا اور لوگوں کے مکانات حریف کیمپ بن گیے اور پورے کا پورا ملک خانہ جنگی (Civil war) کا شکار تھا، بحث یہ تھی کہ مسیح کی فطرت کیا تھی؟ اور اس میں الٰہی اور بشری جزو کس تناسب سے ہیں، روم و شام کے ملکانی (Malkites) عیسائیوں کا مذہب یہ تھا کہ حضرت مسیح کی فطرت مرکب ہے، اس میں ایک جزو الٰہی ہے، اور ایک بشری لیکن مصر کے منوفیزٹ (Monophysites) عیسائیوں کا اصرار تھا کہ حضرت مسیح کی فطرت خالص الٰہی ہے، اس میں ان کی فطرتِ بشری اس طرح فنا ہوگئی ہے، جیسے شرک کا قطرہ سمند میں پڑ کر اپنی ہستی کو گم کر دیتا ہے۔ (حوالہ بالا:۳۵)

اپنے اصل مقصد کو چھوڑ کر فانی دنیا کو باقی دنیا پر ترجیح دیتے ہوئے ان دونوں فرقوں میں اتنا اختلاف بڑھا کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو ایسا ہی خارج از مذہب اور بددین سمجھتے تھے، جیسے دو متضاد مذہب کے پیرو۔

(حوالہ بالا:۳۶، Thirty years of roman dominion:29,30)

''تاریخ عالم برائے مؤرخین کے مصنّفین لکھتے ہیں:

''بڑے بڑے شہر جن میں تیزی کے ساتھ بربادی آئی اور پھر وہ سنبھل نہ سکے،..... وہ گواہ ہیں کہ بازنطینی حکومت کے اس زمانے میں انحطاط وتنزل کے عالم میں تھی، اور یہ تنزل ٹیکس اور محصول میں زیادتی، تجارت میں پستی، زراعت سے غفلت، شہروں کی آبادی میں روز افزوں کمی کا نتیجہ تھا''۔

(حوالہ بالا:۳۷، Historians history of the world:v2/p175)

یورپ کو بھی قرآنی ھدایت کا انتظار

پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی گویا کہ یورپ بھی زبانِ حال سے اس قرآن کے آسمانی ارشادات کا منتظر تھا جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ مکرمہ میں ۵۷۰ عیسوی میں پیدائش سے وجود پذیر ہونے والے تھے۔ رابرٹ بریفالٹ ..... ROBERT BRIFFAULT لکھتا ہے:

''اور یہ تاریکی تدریجا زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جارہی تھی۔ اس دور کی وحشت و بربریت زمانۂ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجے زیادہ بڑھی چڑھی تھی کیوں کہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی تھی جو سڑ گئی ہو''۔

(حوالہ بالا:ص۳۸ A SHORT HISTORY OFTHE WORLD P.38)

یھود کی بیمار حالت

یورپ، ایشیا، افریقہ میں بسنے والی یہود نام کی قوم دنیا کی تمام قوموں میں اس لحاظ سے ممتاز تھی کہ اس کے پاس دین کا بہت بڑا سرمایہ تھا، اس میں توریت کی برکت سے اپنی تعبیرات واصطلاحات سمجھنے کی سب سے زیادہ صلاحیت تھی ''چھٹی صدی (عیسوی) کے آخر میں یہودیوں اور عیسائیوں کی باہم رقابت و منافرت اس حد کو پہونچ گئی تھی کہ ان میں سے کوئی دوسرے فریق کو ذلیل کرنے اور اس سے اپنی قوم کا انتقام لینے اور مفتوح کے

ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا''۔(ص۳۹)

ایرانی تخریب

متمدن دنیا میں تولیت وانتظام اور بست وکشاد میں ایران ،روم کا ہم پلہ تھا ....لیکن وہاں کی اخلاقی بنیادیں عرصۂ دراز سے کھوکھلی اور متزلزل چلی آرہی تھیں، جن رشتوں سے ازدواجی تعلقات دنیا کے مہذب ومتمدن علاقوں کے باشندے ناجائز سمجھتے رہے ہیں، ایرانیوں کو ان کی حرمت وکراہت تسلیم نہیں تھی؛ چناں چہ ''یزدگرد دوم جس نے پانچویں صدی کے وسط میں حکومت کی ہے، اس نے اپنی لڑکی کو زوجیت میں رکھا، پھر قتل کردیا، بہرام چوبیں جو چھٹی صدی عیسوی میں حکمراں تھا اس نے اپنی بہن سے ازدواجی تعلق رکھا' پروفیسر آرتھر کرسٹن سین کے مطابق اس قسم کا رشتہ ایران میں کوئی ناجائز فعل تصور نہیں کیا جاتا تھا' بلکہ ایک عبادت اور کارِثواب سمجھا جاتا تھا' مشہور چینی سیاح (ہیوین سیانگ) کا بیان ہے کہ ایرانی قانون ومعاشرت میں ازدواجی تعلقات کے لیے کسی رشتے کا بھی استثنا نہ تھا''۔

(تاریخ طبری:۲/ ۱۳۸، ایران بعہد ساسانیاں ۴۳۰، بحوالہ انسانی دنیا پر:۴۱)

ہندوستان کی مذہبی واخلاقی صورت حال

''ہندوستان کے مؤرخین کا اس نقطے پر اتفاق ہے کہ چھٹی صدی عیسوی سے جو زمانہ شروع ہوتا ہے وہ مذہبی' اجتماعی اور اخلاقی لحاظ سے پست ترین دور تھا'' جس کو تین بڑے عنوانات میں بانٹا جاسکتا ہے'' (۱) معبودوں کی حد سے بڑھی ہوئی کثرت (۲) جنسی خواہشات کی بحرانی کیفیت (۳) طبقاتی تقسیم اور معاشرتی امتیازات۔'' ڈاکٹر گستاؤلی بان ''تمدنِ ہند'' میں لکھتا ہے:

> ''دنیا کی تمام اقوام میں ہندو کے لیے پرستش میں ظاہری صورت کا ہونا لازمی ہے' اگرچہ مختلف ازمنہ میں مذہبی اصلاح کرنے والوں نے ہندو مذہب میں توحید کو ثابت کرنا چاہا ہے' لیکن کوشش بالکل بے فائدہ ہے۔ ہندو کے نزدیک کیا ویدی زمانہ میں اور کیا اس وقت ہر چیز خدا ہے' جو کوئی چیز اس کی سمجھ میں نہ آئے یا جس سے وہ مقابلہ نہ کرسکے اس کے نزدیک پرستش کے لائق ہے''۔ (تمدنِ ہند:۴۴۰' بحوالہ انسانی دنیا پر:۵۰)

ڈاکٹر بان کے اس پیراگراف سے ہندؤں میں معبودوں کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی کثرت پر اچھی طرح روشنی پڑتی ہے۔ جنسی بحران کا ہندوؤں میں وجود ایسا ہے کہ شہوانی جذبات اور جنسی میلان کو ابھارنے والے عناصر مذہبی صورت میں جس قدر ہندوستان کے قدیم مذہب وتمدن میں پائے جاتے ہیں کسی دوسرے ملک وتمدن میں نہیں پائے جاتے' عبادت وپوجا کی لائن سے شہوانی راہ اس طرح بآسانی ہموار ہوتی ہے کہ ان کے یہاں بڑے دیوتا شیوا کے آلہ تناسل (لنگم) تک کی پوجا ہوتی رہی ہے۔ڈاکٹر بان لکھتے ہیں:

> ''.................. ان کے مندر پرستش کی چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں جن میں سب سے مقدم لنگم (آلۂ تناسل) اور یونی ہیں' جن سے مراد مادۂ خلقت کے دونوں جزو ہیں' اشوک کے ستونوں کو بھی عام ہندو لنگم خیال کرتے ہیں''۔(تمدن ہند:۴۴۱، حوالہ بالا:۵۱)

''بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ ایک مذہبی فرقہ کے برہنہ

مرد عورتوں اور عورتیں برہنہ مردوں کی پرستش کرتے تھے' مندروں کے محافظ و منتظم بداخلاقی کا سرچشمہ تھے''۔
ستیارتھ پرکاش (دیانند سرسوتی: ۳۴۴)

''بہت سی عبادت گاہیں اخلاقی جرائم Corruption کا مرکز تھیں' راجاؤں کے محل اور بادشاہوں کے درباروں میں بے تکلف شراب کا دور چلتا' سرمستی میں اخلاقی حدود برقرار نہ رہتے''۔ (ص ۵۱)

طبقاتی تقسیم اور معاشرتی انتظام کا یہ عالم تھا کہ پورے ہندو سماج کو ۴ر طبقات میں تقسیم کر دیا گیا تھا جس کو قانونی شکل دینے کا سہرا منوجی کے سر ہے' انہوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش سے پیشتر ہندو سوسائٹی کے لیے ایک کتاب مرتب کی تھی جس کو تمام باشندگانِ ملک نے اجماعی طور پر قبول کیا تھا' آخر میں وہی ملکی قانون اور دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا' اسی کو دنیا آج ''منوشاستر'' کے نام سے جانتی ہے۔

''منوشاستر میں چار ذاتیں بیان کی ہیں (۱) برہمن یعنی مذہبی پیشوا (۲) چھتری یعنی لڑنے والے (۳) ویش: زراعت وتجارت پیشہ (۴) شودر جن کا کوئی خاص پیشہ نہ تھا اور جو دوسری ذاتوں کے صرف خادم تھے''۔
منوشاستر میں ہے۔

''قادرِ مطلق نے دنیا کی بہبودی کے لیے اپنے منہ سے اور اپنے بازوؤں سے اور اپنی رانوں سے اور اپنے پیروں سے برہمن' چھتری' ویش اور شودر کو پیدا کیا ہے''۔

''برہمنوں کے لیے وید کی تعلیم اور خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے دیوتاؤں کے چڑھاوے دینا اور دان دینے لینے کو فرض قرار دیا' چھتری خلقت کی حفاظت کرے' دان دے' وید پڑھے اور خواہشاتِ نفسانی میں نہ پڑے، ویش مویشی کی سیوا کرے' دان دے' چڑھاوے چڑھائے ،وید پڑھے' تجارت زراعت کرے، شودر ان تینوں کی خدمت کرے''۔ (منوشاستر باب اول: ۳۱' ۸۷' ۸۸' ۸۹) حوالہ بالا: ۵۳)

منوشاستر باب دوم: ص ۱۳۵ پر منوجی لکھتے ہیں:

''دس سال کی عمر کا برہمن اور سو سال کی عمر کا چھتری گویا آپس میں باپ بیٹے کا رشتہ رکھتے ہیں لیکن ان دونوں میں برہمن باپ ہے۔'' منو لکھتے ہیں ''اگر شودر دو جوں پر ہاتھ یا لکڑی اٹھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے گا اور اگر وہ غصے میں لات مارے تو اس کا پیر کاٹ ڈالا جائے گا''۔

(منوشاستر باب ہشتم: ۲۸۰ بحوالہ انسانی دنیا پر: ۵۵)

مرکز اسلام عرب کو ھدایتِ قرآنی ضرورت

گذشتہ اوراق میں دنیا کے مشہور ترین مقامات و مذاہب روم و ایران اور ہندوستان کے حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد خود مرکزِ اسلام عرب کے احوال و کیفیات اور اخلاقی و اجتماعی صورت حال پر نظر ڈالتے چلیں تا کہ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے کہ قرآنِ کریم کے کلام میں ہدایتِ ربانی کا اسلوب کتنا جامع' پختہ' وسیع تر اور اعتدال پسندانہ مزاج کا حامل ہے' ''ماذا خر العالم بانحطاط المسلمین'' کے مصنف لکھتے ہیں:

''دورِ جاہلیت میں عرب اپنی بعض فطری صلاحیتوں اور بعض عادات واخلاق میں تمام دنیا میں ممتاز تھے' فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی میں ان کا کوئی ہمسر

نہ تھا' آزادی وخودداری ان کو جان سے زیادہ عزیز تھی.....لیکن انبیاء اوران کی تعلیمات کے بعد ایک جزیرہ نما میں صدیوں سے مقید رہنے کی وجہ سے اور باپ دادا کے دین اور قومی روایات پر سختی سے قائم ہونے کے سبب وہ دینی واخلاقی حیثیت سے بہت گر چکے تھے ۔چھٹی صدی (جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت با سعادت ہوئی) میں وہ تنزل وانحطاط کے آخری نقطے پر تھے۔عرب میں ہر ہر قبیلہ' ہر ہر شہر' اور ہر ہر علاقے کا ایک خاص بت تھا' بل کہ ہر گھر کا بت جدا تھا' کلبی کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ کے ہر گھر کا ایک بت تھا جس کی گھر والے پرستش کرتے تھے۔جب کوئی سفر سے واپس آتا تو گھر پہنچ کر پہلا کام یہ کرتا کہ اپنے بت کو تبرکاً ہاتھ لگا تا ''۔(کتاب الا صنام :۲۳)۔(کوئی)حرم کے سامنے ایک پتھر گاڑ دیتا یا حرم کے علاوہ جہاں بہتر سمجھتا پتھر گاڑ کر اس کے اردگرد اس شان سے طواف کرتا جس طرح بیت اللہ کے گرد طواف کیا جاتا ہے ۔ان پتھروں کو وہ انصاب کہا کر تے تھے۔ (کتاب الاصنام :۲۳)،صحیح بخاری میں کتاب المغازی باب فتح مکہ کے تحت درج ہے کہ خانہ کعبہ کے صحن میں ۳۶۰/بت تھے ۔ بخاری میں ابو رجاء العطاردی سے روایت ہے کہ'' ہم لوگ پتھر کو پوجتے تھے اگر کوئی اس سے اچھے قسم کا پتھر مل جاتا تو اس کو پھینک کر اس نئے پتھر کو لے لیتے اور اگر پتھر نہ پاتے تو مٹی کا ایک ڈھیر بناتے اور اس پر بکری کو لا کر دوہتے ، پھر اسی کا طواف کرتے ۔طبقات الامم،صاعد اندلسی :ص۴۳۰/ پر کلبی کا بیان ہے کہ کوئی شخص سفر میں کوئی نئے مقام پر اترتا تو چار پتھر لے آتا، جو پتھر اس کو اچھا معلوم ہوتا اس کو معبود قرار دیتا اور باقی تین پتھروں کو اپنی ہانڈی کا پتھر بناتا اور جب وہاں سے جاتا تو سب پتھروں کو چھوڑ جاتا۔ (کتاب الاصنام :۴۴، طبقات الامم-صاعد اندلسی: ص۴۳۰) پر کلبی کا بیان ہے قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنو ملیح تھی' جو بتوں کو پوجتی تھی ۔صاعد کی روایت ہے کہ قبیلۂ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا۔ کنانہ کا قبیلہ' چاند کا پرستار تھا۔بنو تمیم وبران کی' لخم وجذام مشتری کی قبیلۂ طے سہیل کی' بنو قیس شعریٰ کی اور بنو اسد عطارد کی پرستش کرتا تھا''۔(کتاب الاصنام وطبقات الامم)۔

مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

''شراب عام طور سے پی جاتی تھی اور ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی' اس کا تذکرہ ان کی ادبیات وشاعری میں بڑی جگہ کو گھیرے ہوئے ہے' عربی زبان میں اس کے نام جس کثرت سے ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت وعمومیت کا اندازہو سکتا ہے۔(المخصص از ابن سیدہ:الخمر ۱۱/۲'۸۲)، علامت کے طور پر شراب کی دوکانوں پر پُھریرا لہراتا۔(سبعہ معلقہ)، جوا کھیلنا خوبی کی بات تھی' اس میں شرکت نہ کرنا مردہ دلی کی دلیل تھی۔(دیوان حماسہ)،لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا''ہشیم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ زندہ درگور کرنے کا اصول عرب کے تمام ہی قبائل میں رائج تھا' یہ سلسلہ اسلام آنے تک جاری رہا (میدانی)،''بلوغ الادب فی احوال العرب آلوسی'' میں ہے کہ''ایسے موقعے پر

رؤساء بچوں کو خرید لیتے اور ان کی جان بچاتے۔ صعصعہ بن ناجیہ کا بیان ہے کہ اسلام کے ظہور کے وقت تک' تین سو زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو فدیہ دے کر بچا چکا تھا(کتاب الاغانی)، سنن دارمی: جلد۱، باب **ما کان علیہ الناس قبل مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الجھل والضلالۃ** میں ہے کہ اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلے کے بڑے اندوھناک اور رقت انگیز واقعات بیان کیے ہیں''۔

(مستفاد: انسانی دنیا پر مسلمانوں کا عروج وزوال: ۵۷تا۶۲)

عالم گیر تاریکی کے لیے عالم گیر روشنی

گذشتہ سطروں میں آپ یہ بات جان چکے ہوں گے کہ اطرافِ عالم میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا' ہر طرف گھٹا ٹوپ تاریکی کے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے، روشنی کی کرن کی کوئی امید نہ تھی'' ساتویں صدی مسیحی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی تھی جس کو مزاج کے اعتبار سے صالح کہا جا سکے اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی' جو شرافت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہو' نہ ایسی کوئی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل وانصاف اور رحم پر ہو' اور نہ کوئی ایسی قیادت تھی' جو علم وحکمت اپنے ساتھ رکھتی ہو' اور نہ کوئی ایسا دین تھا جو انبیائے کرام کی طرف صحیح نسبت رکھتا ہو اور ان کی تعلیمات وخصوصیات کا حامل ہو۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کہیں کہیں عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں اگر کبھی کبھی روشنی نظر آجاتی تھی تو اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو چمکتا ہے۔ صحیح علم اور صحیح عمل اتنا نایاب تھا اور خدا کا راستہ بتلانے والے اس قدر خال خال پائے جاتے تھے کہ ایران کے بلند ہمت اور بے چین طبیعت نوجوان سلمان فارسی کو.................ایران سے لے کر شام کے آخری حدود تک اپنے طول طویل سفر میں صرف چار آدمی ایسے مل سکے جن سے اس کی روح کو سکون اور قلب کو اطمینان حاصل ہو''۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں عروج وزوال کا اثر:۸۴)

اس عالمگیر تاریکی اور فساد کے عالم میں ایک ایسے ہی عالمگیر قانونِ ہدایت کی ضرورت تھی جس کی کتاب قرآن مجید نے پورے عالم پر چھائی ہوئی تاریکی اور شر وفساد کا نقشہ جس طرح کھینچا ہے شاید نہیں یقیناً اس سے بہتر نقشہ کھینچنا ممکن نہیں۔ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ — خرابی پھیل گئی خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے نتیجے میں، تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھادے اور وہ بعض آجائیں۔ (الروم:۴۱)

عالم گیر تاریکی میں عالم گیر ہدایت

پچھلے صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ پوری کائنات جہالت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی اور عالم گیر تاریکی میں ہر طرح کی روشنی کی امید ختم ہو چکی تھی۔ اس عالم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کو دنیا کی تاریکی چھانٹنے کے لیے ایک نور عطا فرمایا جس کے بارے میں خود ارشاد ربانی ہے: ﴿قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ﴾ — یقیناً تمہارے پاس اللہ کی جانب سے ایک عالم گیر نور اور ایک واضح کتابِ ہدایت آگئی ہے۔ اس کتابِ ہدایت میں اللہ تعالیٰ نے پانچ بڑے بڑے روشنی کے مینار اور علوم وآگہی کے مضامین بیان فرمائے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر میں قرآن کریم کے سارے علوم کو پانچ اقسام میں بانٹا ہے:

(۱) علم الاحکام　(۲) علم الجدل

(۳) علم التذکیر بایام اللہ　(۴) علم التذکیر بآلاء اللہ

(۵) علم التذکیر بالموت و مابعد الموت

دورِ حاضر کے مشہور مفتی اور قاضی حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی نے علوم القرآن میں قرآن کریم کے مضامین و علوم کو ۴ر بڑے بڑے عنوانات میں تقسیم فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ” قرآن کریم کے مضامین پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ تمام مضامین چار بڑے بڑے عنوانات پر منقسم ہیں۔ اور قرآن کریم کی ہر آیت ان میں سے کسی ایک عنوان کے تحت ضرور آتی ہے: (۱) عقائد (۲) احکام (۳) قصص (۴) امثال

﴿۱﴾ عقائد

قرآن کریم میں بنیادی طور پر تین عقائد کو ثابت کیا گیا ہے: (۱) توحید (۲) رسالت (۳) اور آخرت

توحید کا مطلب یہ ہے کہ انسان کائنات کے ذرے ذرے کو صرف ایک ذات کی مخلوق سمجھے۔ اسی کو پوجے۔ اسی سے ڈرے۔ اسی سے مانگے اور دل میں یقین رکھے کہ اس بیکراں کائنات کا ہر ذرہ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور کوئی دوسرا اس کی توفیق کے بغیر اسے اِدھر سے اُدھر نہیں کرسکتا۔

رسالت کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے تمام پیش رو پیغمبروں کو خدا کا سچا رسول سمجھے، جس بات کو وہ حق کہیں اسے حق سمجھے، اور جو بات ان کے نزدیک باطل ہو اسے باطل ٹھہرائے۔

آخرت کا مطلب یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد ایک ایسی زندگی پر ایمان رکھے جو ابدی ہوگی، اور اس میں ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے اپنی زندگی میں کیے ہیں۔ اگر اس نے اچھے کام کیے ہوں گے تو وہ جنت کی سرمدی نعمتوں کا حقدار ہوگا اور اگر اس نے برے کام کر کے اپنی دنیوی عمر ضائع کی ہے تو وہ دوزخ کے دائمی عذاب کا مستحق ہوگا۔ (علوم القرآن: ۲۹۳، ۲۹۴)

عقائدِ حقہ کو ثابت کرنے کا اسلوب

پوری کائنات کی تاریکی کو چھانٹنے اور ان کے باطل عقائد کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں انواع واقسام کے اسالیب اختیار فرماتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لیے جن دلائل کو استعمال کیا ہے انہیں عقلی طور پر چار قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔

﴿۱﴾ **نقلی دلیل**: کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے یا تو انسان کسی ایسی اتھارٹی کا حوالہ دیتا ہے جو اپنے مخالف کے نزدیک بھی واجب التسلیم ہو، یہ دلیل نقلی ہوتی ہے۔

﴿۲﴾ **منطقی دلیل**: یا پھر وہ منطقی انداز سے اپنے دعوے پر دلیل لاتا ہے، یہ منطقی دلیل ہے۔

﴿۳﴾ **مشاھداتی دلیل**: یا وہ اپنے مخالف کو ایسی چیزیں دکھاتا ہے جس سے ہر انسان اس نتیجے تک پہنچتا ہے جہاں مدعی پہنچا ہے یہ مشاہداتی دلیل ہوتی ہے۔

﴿۴﴾ **استقرائی یا تجرباتی دلیل**: یا پھر وہ اپنے نقطۂ نظر کو درست ٹھہرانے کے لیے دنیا کے سابقہ واقعات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ دیکھو ماضی میں میرے نظریے کے مطابق عمل کیا گیا تھا تو دنیا نے فلاح پائی تھی اور فلاں قوم نے اس نظریے کے خلاف عمل کیا تھا تو وہ تباہ ہوگئی تھی، ایسی دلیل کو تجرباتی یا

استقرائی دلیل کہا جاتا ہے۔ (مستفاد علوم القرآن: ۲۹۴)

نقلی دلیلیں

جہالت وضلالت کو مٹانے اور حق کا بول بالا کرنے کے لیے اور ہمہ گیر تاریکی میں عالم گیر روشنی پھیلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ میں پوری دنیا کے لیے آخری نبی بنا کر بھیجا. آپ کی نبوت ورسالت ثابت کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نقلی دلیل کا یوں ذکر فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ﴾ (الشعراء)-اور بلاشبہ ان کی خبر پچھلے لوگوں کے صحیفوں میں ہے۔

اس آیت میں باری تعالیٰ نے کافروں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرتے ہو؛ حالاں کہ جو کتابیں تمہارے نزدیک معتبر ہیں یعنی تورات وانجیل خود ان میں (تحریف ہو جانے کے باوجود) آج تک آپ کی رسالت کا ذکر ہے۔ توراۃ کے سفر استثنا میں ہے۔ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کی پہاڑ یوں سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔

فاران اور شعیر کی پہاڑیوں سے اللہ کے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی جلوہ گر ہوئے۔ (استثناء ب:۳۳، درس۲) اور دس ہزار قدسیوں سے صحابہ کرام کی فتح مکہ کے موقع پر جو تعداد تھی وہ مراد ہے۔

اسی طرح انجیل میں ہے کہ جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ (یوحنا: ۱۲/۱۵)

تمام سچائی کی راہ دینِ محمد پر ہی صادق آتی ہے کہ یہ دین کامل ہے جو ﴿ الیوم اکملت... الخ ﴾ سے ظاہر ہے۔

منطقی دلیلیں

منطقی دلائل میں سے تقریباً ہر قسم کی دلیل قرآن میں مذکور ہے مثلاً: قیاس اقترانی، قیاس استثنائی، السبر والتقسیم، تسلیم، انتقال وغیرہ۔

قیاس اقترانی

یہ دلیل کثیر الاستعمال ہے، اس میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کر کے اپنے دعوے کو اس کلیے پر منطبق کیا جاتا ہے، اس کی مثال سورۂ طٰہٰ کی آیت ﴿ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴾ (طٰہٰ)۔

قیاسِ استثنائی کی دلیل میں عام طور پر کسی چیز کی نفی ملحوظِ خاطر ہوتی ہے، جس میں دو جز ہوتے ہیں:

(۱) صغریٰ (۲) کبریٰ

صغریٰ کو کبریٰ پر موقوف کر دیا جاتا ہے، پھر کبریٰ کی نفی سے خود صغریٰ کی نفی ہو جاتی ہے، اس کی مثال قرآن کریم کی مشہور آیت: ﴿ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ﴾ ہے، السبر والتقسیم کی دلیل میں مدمقابل کے دعوے کو اس طرح رد کر دیا جاتا ہے کہ چند احتمالات اس کے دعوے سے متعلق ذکر کرنے کے بعد ہر احتمال کی نفی کر دی جاتی ہے، اس کی مثال قرآن کریم کی سورہ انعام کی یہ آیت ہے:

﴿ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ، قُلْ ءٰۗ الذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ، اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ﴾ (انعام)

تسلیم کی منطقی دلیل میں مخالف کی کسی بات کو تسلیم کر لینے کے بعد کہا جاتا ہے کہ اس کے باوجود تمہارا مدعا ثابت

نہیں ہوتا، اس کی مثال ہے، سورۂ انعام کی آیت: ﴿ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ﴾ (سورۂ انعام)- اور انتقال میں ایسا کہا جاتا ہے کہ مخالف کو مناظرہ کی کوئی دلیل پیش کی، اس نے کج فہمی سے اس کو رد کر دیا تو ایسے موقع پر فوراً دوسری دلیل پیش کی جاتی ہے۔ اس کی مثال وہ مناظرہ ہے جو نمرود اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان ہوا تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهِيْمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ، قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ، قَالَ اِبْرٰهِيْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ، وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ میں پیش کیا ہے۔ (مستفاد: علوم القرآن: ۳۰۰)

مشاہداتی دلیلیں

مشاہداتی دلیلیں مشاہدے سے تعلق رکھتی ہیں ۔ قرآن کریم میں مشاہداتی دلائل کو اللہ تعالی نے کثرت سے استعمال کیا ہے کیوں کہ ایسا بہت ہوتا ہے کہ آدمی منطقی دلیل سے ساکت ہوجاتا ہے لیکن قائل نہیں ہوتا ، قرآن کریم کا مقصود کسی کو خاموش کرنا نہیں ہے بلکہ اس کے اندر کلمۂ حق اور اس کے تمام مقتضیات اتارنا ہے تاکہ اس کی سرمدی زندگی کامیاب ہوجائے اور وہ پکار اٹھے: البعرة تدل على البعير ، والاثر على المسير ، فسماء ذات أبراج ، وأرض ذات فجاج كيف لا تدل على اللطيف الخبير ۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نمل کی آیت میں ''اَمن خلق'' سے لے کر ''تعالى الله عما يشركون ... الخ'' تک مشاہداتی دلیل ہی ذکر کی ہے۔

تجرباتی دلیلیں

انسان کی طبیعت کو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ جن چیزوں کا اس نے تجربہ کر رکھا ہے ان کے حوالے سے تسلیم و رضا اس کے اندر جلد پیدا ہو جاتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے بہت ساری جگہوں پر یہی اسلوب اختیار فرمایا ہے تاکہ بندگانِ خدا اپنی گمراہی سے ہدایت کے سائے تلے آجائیں، جگہ جگہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ، كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَ عَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ، فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ (الروم)، سورۂ قصص میں ارشاد ہے: ﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ م بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ، فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ م بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ، وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴾ (قصص) (مستفاد :علوم القرآن ۲۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۳۰۴)

یہ گزشتہ عقائد کی بحثیں ایجابی پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں ، عقائد کے کچھ سلبی پہلو بھی ہیں جن سے قرآن کریم نے بحث کی ہے انہیں کو اصول تفسیر کی اصطلاح میں آیات الجدل یا آیات المخاصمہ کہتے ہیں، اس میں چار فرقوں کے عقائد سے سلبی پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر گفتگو کی جاتی ہے۔

(۱) پہلا فرقہ، مشرکین و پرستارانِ اصنام کا ہے

(۲) دوسرا فرقہ نصرانیوں کا ہے

(۳) تیسرا فرقہ یہودیوں کا

(۴) چوتھا فرقہ منافقین کا

مشرکین

اس فرقے میں ۵رطرح کی برائیاں تھیں (۱) شرک (۲) تشبیہ (۳) تحریف (۴) انکارِ رسالت (۵) انکار آخرت

﴿۱﴾ **شـــرک** :مشرکین واصنام پرست لوگ خدا تعالی کی مخصوص صفات میں شریک ٹھہراتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ تمام چیزوں کا خالق اگر چہ اللہ تعالی ہی ہے لیکن بادشاہ کو جیسے اپنے قلمرو کے مختلف شعبہائے مملکت کو دوسرے حضرات کو سونپنا پڑتا ہے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے بھی کیا ہے (سورۂ نمل کی آیت : مانعبدھم الخ) میں اللہ تعالیٰ نے اسی کو بیان فرمایا ہے۔شرک کی یہ گمراہی سب سے پہلے عمرو بن لحی نے پھیلائی تھی جس کا قرآنِ کریم نے مختلف اسالیب سے ردفرمایا ہے۔کہیں ان سے دلیل کا مطالبہ فرما کر تو کہیں اپنی قدرتِ کاملہ بتلا کر کہ اس کا ارادہ ہی بڑے سے بڑی چیز کو عدم کے پردوں سے نکال کر وجود کے اسٹیج پر لا کھڑا کرتا ہے، کہیں انہیں اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا کہ جو پتھر کل تک لوگوں کی ٹھوکروں پڑا تھا وہ آج ہتھوڑے کی ضرب کھا کر خدا کیسے بن گیا۔صرف لات اور ہبل نام رکھ لینے سے اس میں رزق دینے کی صلاحیت کہاں سے آ گئی؟ ﴿وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ج وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ج اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ ﴾۔

﴿۲﴾ **تشبیه** : خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کر کے وہ بت پرست اللہ تعالیٰ کو مجسم اور بیوی بچوں والا تصور کرتے، وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں اور جنات کی لڑکیوں کو خدا کی ازواج کہا کرتے تھے،جس کی نفی "لم یلد و لو یولد....." سے کی گئی۔

﴿۳﴾**تحریف**: مشرکین اپنے کو ملتِ ابراہیمی کا پیرو تصور کرتے تھے، پھر بھی بہت سے احکام وقوانین میں تحریف کے مرتکب تھے، ننگے ہو کر طواف کرنا، نماز کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجانا، مہینوں کو آگے پیچھے کر لینا، اللہ تعالیٰ نے ان کی تحریفات کا ذکر قرآن میں یوں فرمایا ہے:

﴿ یـأیهـا الذین آمنوا خذوا زینتکم عند کل مسـجـد﴾ ﴿و ما کان صلاتهم عند البیت إلا مکاء و تصدیة﴾ ﴿ إنما النسیٔ زیادة فی الکفر﴾..

﴿۴﴾ **انکارِ رسالت**: مشرکین کی چوتھی گمراہی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار کا وطیرہ تھا، وہ کہتے تھے کہ ہم جیسا انسان نبی ورسول کیسے ہوسکتا ہے؟، ہماری طرح کھاتا، پیتا، بازاروں میں چلتا پھرتا، شادی بیاہ کرتا ہوا بشر کہیں رسول بن سکتا ہے؟! اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں فرمایا ہے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ ﴾۔ (سورۂ یوسف:۱۰۹)

﴿۵﴾ **انکـارِ آخرت** : کفار ومشرکین کہا کرتے تھے کہ : ﴿ وَ مَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا اِلَّا لَهْوٌ وَ لَعِبٌ ﴾۔مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ایک دھوکہ ہے، جو کچھ کھا پی لیا یہی نفع ہے، آگے نہ کوئی جنت ہے نہ دوزخ' نہ حساب وکتاب کا کوئی معاملہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید میں فرمایا ہے:

﴿ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ الْاَرْضَ وَلَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰی ۰ ﴾ (احقاف:۳۳)

یهود

عقائدِ باطلہ کی تردید ونفی کے لیے، اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی گمراہیوں کا ذکر، قرآنِ کریم میں فرمایا ہے جو اپنی

آسمانی کتاب توریت میں تحریف کے مرتکب تھے، ان کی تحریف تین طرح کی تھی:

(۱) **تحریف لفظی**: توریت کی آیتوں کا غلط ترجمہ کرکے عوام الناس کو گمراہ کرتے۔

(۲) **تحریفِ معنوی**: توریت کی آیات کا اپنی طرف سے مطلب گھڑ کر پیش کرتے اور دوسروں کو اس پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے۔

(۳) **تیسری گمراہی**: یہودیوں کی یہ تھی کہ توریت کی بہت سی آیات کو چھپاتے تاکہ ان کی دنیوی وجاہت پر دھبہ نہ آئے، اللہ کے رسول (ﷺ) کی بشارت والی آیات اور زنا کی سزا رجم ہے، اس آیت کو چھپاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ان تحریفات کو قرآنِ کریم کی آیات میں یوں بیان فرمایا ہے:

﴿ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾ ﴿ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴾ ﴿ اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ﴾ ۔(بقرہ:۸۰، ۸۱، ۷۶- مستفاد: علوم القرآن:۳۰۸، ۳۰۹)

نصاری

عالم گیر گمراہی کو چھانٹنے والی کتاب قرآنِ کریم نے نصاریٰ میں پائی جانے والی غلط کرداریوں کا پردہ یوں چاک کیا ہے کہ عیسائی تثلیث کے قائل تھے اور اللہ تعالیٰ کو تین اقانیم (اجزاء) کا مجموعہ کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا:

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ﴾ (مائدہ)

اور اپنے کو موحد ثابت کرنے کے لیے عجیب وغریب تشریحات کرتے، کہتے تھے کہ تین اقانیم تین اجزاء ہیں: پہلا جزو باپ ہے، دوسرا بیٹا، اور تیسرا روح القدس۔ بیٹے کا جزو عیسیٰ علیہ السلام کے روپ میں آکر دنیا میں جلوہ گر ہوا، اور یہ تینوں جزمل کر متحد ہیں، اس وحدت کو مان کر ہم موحد ہیں، اسی لیے اللہ نے ان کے اس عقیدے کی تردید ''لقد کفر... الخ'' فرما کر ذکر کی ہے۔

منافقین

منافقین کا گروہ ان شریر، بدطینت، کم حوصلہ اور بزدل انسانوں کا گروہ تھا جن کا قلب تو کفر وشرک کی پلیدی اور بتوں سے آباد تھا، جنہیں دوسرے کفار کھلم کھلا پوجتے تھے؛ مگر ان بے چاروں کو اتنا حوصلہ کہاں تھا کہ یہ اپنے عقائد کا کھلم کھلا اعلان کرسکیں، زبان سے توحید ورسالت اور آخرت کا عقیدہ رکھنے کا اقرار کرتے تھے اور در پردہ مسلم سماج اور صحابہ کے خلاف پروپیگنڈہ اور سازش کا جال بُنتے رہتے تھے۔

چوں کہ یہ گروہ اپنا مستقل کوئی عقیدہ نہیں رکھتا تھا اس لیے ان کے عقائد کی صراحتاً تردید کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا، البتہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال اور اور سورۂ توبہ میں بالخصوص ان کی خباثتوں، سازشوں اور بری خصلتوں کو طشت از بام کیا ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہدایتِ عامہ کے ذریعے پھیلی ہوئی گھٹا ٹوپ تاریکی کا پردہ چاک کیا ہے۔

﴿۲﴾ احکام

چھٹی صدی عیسوی میں پھیلی ہوئی عالم گیر تاریکی کو ختم کرنے کے لیے جب اللہ نے عالم گیر ہدایت کا پرچم لہرایا جس کے لیے قرآنِ کریم کا نزول شروع کیا تو یہ قرآن جن بڑے بڑے ۴ رمضامین پر مشتمل تھا ان میں سے ایک مضمون ''عقائد'' کا تھا جس کا بیان اوپر گذر چکا۔ دوسرا مضمون ''احکام'' کا ہے جس کی قدرے تفصیل مندرجہ ذیل سطروں میں ملاحظہ فرمائیں:

علوم القرآن میں مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ ''احکام'' پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''قرآنِ کریم کا دوسرا مضمون ''احکام'' ہے، اس میں جن احکام کا ذکر کیا گیا ہے انہیں ہم اپنی نوعیت کے اعتبار سے تین قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) وہ احکام وقوانین جو خالص اللہ کے حقوق سے متعلق ہیں، جنہیں مختصر الفاظ میں خالص ''عبادات'' کہا جاسکتا ہے، اس میں طہارت، نماز، زکاۃ، روزہ، قربانی اور حج کے احکام داخل ہیں، اور قرآن کریم نے ان چیزوں سے متعلق بنیادی ہدایات عطا فرمائی ہیں۔

(۲) وہ احکام وقوانین جو خالص بندوں کے حقوق سے متعلق ہیں، جنہیں ''معاملات'' سے تعبیر کر سکتے ہیں، مثلاً: تجارت، قضا، شہادت، امانت، گروی رکھنا، ذبیحہ جانوروں کو کھانا، مختلف مشروبات کا استعمال، وصیت اور میراث وغیرہ، ان کے احکام خود قرآن کریم میں موجود ہیں۔

(۳) وہ احکام وقوانین جو بعض حیثیت سے عبادت ہیں اور بعض حیثیت سے معاملہ، اس نوع میں نکاح و طلاق، حدود وتعزیرات (Criminal laws) دیانت، قصاص (Torts)، جہاد، ایمان، قسمیں اور شرکت کے احکام قرآنِ کریم نے ذکر فرمائے ہیں''۔

(علوم القرآن: از مفتی تقی عثمانی: ۳۱۱، ۳۱۲)

﴿۳﴾ قصص

دنیا میں جس نوع کی گمراہی اور تباہی عام تھی اس کے خاتمے کے لیے اسی نوع کی کتابِ ہدایت ضروری تھی جس میں ہر پہلو سے گمراہی ختم کرنے کے عمدہ اسالیب موجود ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس گمراہی کو ختم کرنے کے لیے قرآنِ کریم کو نازل فرمایا جس میں گمراہی کے ازالے کے تمام تر مؤثر اسلوب موجود ہیں، ان میں ایک اسلوب برائی کے خاتمے اور نیکی کی خو اپنانے کا یہ ہے کہ بھٹکی انسانیت کو ماضی کے قصص اور گذشتہ اقوام وملل کے واقعات سنائے جائیں اور مستقبل کے حادثات ونتائج سے قطعی خوف دلایا جائے، اللہ کی آخری کتاب قرآنِ کریم میں ''قصص وواقعات'' کا بھی اچھا خاصہ مواد ہے جس سے امتوں کو راہ راست پر لانے کی محمود سعی کی گئی ہے۔

ماضی کے واقعات

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ماضی کے واقعات میں ۲۷/انبیائے کرام کا ذکر فرمایا ہے جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: (۱) حضرت آدمؑ۔ (۲) حضرت ادریسؑ۔ (۳) حضرت ہودؑ۔ (۴) حضرت صالحؑ۔ (۵) حضرت ابراہیمؑ۔ (۶) حضرت اسماعیلؑ۔ (۷) حضرت اسحاقؑ۔ (۸) حضرت لوطؑ۔ (۹) حضرت یعقوبؑ۔ (۱۰) حضرت یوسفؑ۔ (۱۱) حضرت شعیبؑ۔ (۱۲) حضرت موسیٰؑ۔ (۱۳) حضرت ہارونؑ۔ (۱۴) حضرت یوشعؑ۔ (۱۵) حضرت حزقیلؑ۔ (۱۶) حضرت یونسؑ۔ (۱۷) حضرت الیاسؑ۔ (۱۸) حضرت الیسعؑ۔ (۱۹) حضرت شموئیلؑ۔ (۲۰) حضرت داؤدؑ۔ (۲۱) حضرت سلیمانؑ (۲۲) حضرت ذوالکفلؑ۔ (۲۳) حضرت عزیرؑ۔ (۲۴) حضرت زکریاؑ۔ (۲۵) حضرت یحییٰؑ۔ (۲۶) حضرت عیسیٰؑ۔ (۲۷) حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

انبیائے عظام کے علاوہ حسب ذیل افراد واقوام کا ذکر بھی قرآن کریم نے کیا ہے:

(۱) اصحاب الجنہ ۔ (۲) اصحاب القریہ ۔ (۳) حضرت لقمان ۔ (۴) اصحاب السبت ۔ (۵) اصحاب الرس ۔ (۶) حضرت ذوالقرنین ۔ (۷) اصحاب الکہف ۔ (۸) قوم سبا ۔ (۹) اصحاب الاخدود ۔ (۱۰) اصحاب الفیل ۔

ان واقعات کا ایک مقصد تو تذکیر و موعظت ہے اور دوسرا مقصد نبی امی کی رسالت کی تائید و توثیق اور یہ بھی مقصد ہے کہ ان واقعات کے ذریعے جہالت کی تاریکی دور کر کے علم و عرفان کے خزینے جو ان واقعات کے ضمن میں پوشیدہ ہیں انہیں لٹا کر علم و عمل سے آراستہ کیا جائے۔

مستقبل کے واقعات

قرآنِ کریم میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کا بھی معتد بہ ذکر ملتا ہے، مثلاً قیامت کی علامات، احوالِ قیامت، حشر و نشر کے واقعات اور اس کا منظر، جنت کی رعنائیاں و دلفریبیاں اور دوزخ کی ہولناکیاں اور اس کے دل دوز واقعات و حالات کی تصویر کشی، صورِ اسرافیل، یاجوج ماجوج اور دابۃ الارض کا خروج وغیرہ وغیرہ۔ (مستفاد: علوم القرآن: ۳۱۷، ۳۱۸)

ان واقعات کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے بندے اپنا محاسبہ کریں اور یاد رکھیں کہ جو ذات خالقِ کائنات ہے وہی ہمارے اعمال کا محاسبہ کر کے ہمیں دائمی جزا و سزا کے مقام میں پہنچائے گی۔

﴿۴﴾ امثال

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے دو طرح کی امثال ذکر فرمائی ہیں جن سے عرصہائے دراز کی جمی ہوئی تاریکی کو حاکمانہ و حکیمانہ دونوں انداز سے اس طرح چھانٹنا مقصود تھا کہ پھر دلوں کی روشنی دوبارہ سیاہی و تاریکی سے نہ بدلنے پائے اور یہ دین آخری اور مقبول دین بن کر قیامت تک لوگوں کی راہ نمائی کرتا رہے۔

جن دو طرح کی امثال، قرآنِ کریم میں مذکور ہیں ان میں سے ایک کو تو بات سمجھانے کے لیے تمثیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ، وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (بقرہ:۲۶۱)

اس طرح کی تمثیل سے بات مؤثر اور واضح ہو جاتی ہے۔ دوسری نوع کو اردو زبان میں ''کہاوت'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کی ۲ر قسمیں ہیں، ایک کا موجد تو خود قرآن ہے، مثلاً: ﴿هل جزاء الإحسان إلا الإحسان﴾ اور ﴿أن تعفوا قرب للتقوى﴾ اور دوسری کو ''امثال کامنہ'' کہہ سکتے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ آیت میں غور کرنے سے عوامی ضرب الامثال کا سرچشمہ معلوم ہو، جیسے ﴿ولكن ليطمئن قلبي﴾ کی آیت میں غور کریں تو ''لیس الخبر کالاعیان'' شنیدہ کے بود مانند دیدہ'' کا مفہوم مترشح ہوتا ہے۔

(مستفاد: علوم القرآن از مفتی تقی عثمانی: ۳۱۸-۳۲۰)

مضامینِ قرآن پیش کرنے کا قرآنی اسلوب

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۱۱۴ھ، ۱۱۷۶) نے اپنی کتاب ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' میں قرآن کے مضامین کو پانچ علوم میں تقسیم کیا ہے، قرآنِ کریم کی ہر آیت ان پانچ علوم میں سے کسی نہ کسی علم کے تحت آتی ہے، ان علوم کو ''علومِ خمسہ'' کہتے ہیں، جن کے نام بھی لکھے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:

(۱) علم الاحکام (۲) علم الجدل (۳) علم التذکیر بآلاء اللہ (۴) علم التذکیر بایام اللہ (۵) علم التذکیر بالموت ومابعدالموت۔

مذکورہ بالا علومِ خمسہ جو درحقیقت مضامینِ قرآن ہیں ان کو قرآن نے کس اسلوب میں پیش کیا ہے اس کو بھی شاہ صاحب نے بیان فرمایا ہے، جسے ہم آئندہ صفحات میں اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے (انشاءاللہ)۔

(۱) علم الاحکام: احکام کے مضامین میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قاعدہ کلیہ یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہمارے سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس دنیا میں ''ملتِ ابراہیمی'' کے ساتھ ہوئی ہے، لہٰذا اسی ملتِ ابراہیمی کے شرائع کی بقا ضروری ہے، جس کے بنیادی مسائل میں چنداں تغیر نہ ہوسکے، البتہ بعض جگہ تعمیم کو تخصیص میں بدلنا یا مطلق کو مقید کرنے کی گنجائش ہے۔ اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے پوری دنیا کی اصلاح ہو تو شریعتِ محمدی کے اجزائے ترکیبی اور بنیادی مادے میں عرب کی قدیم عادات اور صالح اطوار کو داخل فرمانے کا اسلوب اختیار فرمایا، اگر ملتِ ابراہیمی پر عمیق نظر ڈالی جائے اور عربوں کی عادات واطوار کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کے معاشرے میں ملتِ ابراہیمی ہی کا عمل دخل تھا جس میں انواع واقسام کی خرابیاں درآئی تھیں۔ طہارت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور ذکر الٰہی کا اصلی طریقہ بدل کر اختراعی طریقہ جنم لے چکا تھا جس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مذکورہ عبادتوں میں سے اکثر عبادات کی لوگوں کو خبر ہی نہیں تھی جس کی وجہ سے بیٹھ کر آپس میں اختلافات کیا کرتے تھے اور جاہلیت کے زمانے کی تحریفات کو ان عبادتوں میں داخل کرتے، ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے اصلاح کا یہ اسلوب اپنایا کہ پہلے ان تمام فسادات و بگاڑ پر انگلی رکھی جن کی اصلاح مقصود تھی اور اصلاح بھی ہوئی، تدبیر منزل جس کو عائلی زندگی اور گھریلو رہن سہن کہہ سکتے ہیں اس میں نہایت خطرناک قسم کے رسم و رواج جڑ پکڑ چکے تھے اور خانگی زندگی میں ایک دوسرے کی حق تلفی اور ظلم وتعدی عام تھی جس سے شہری زندگی کے حقوق کی ادائیگی پر گہرا اثر پڑ رہا تھا، اور ''سیاستِ مَدَنِیَّہ'' کے احکام پر عمل تقریباً متروک تھا، ایسے حالات میں قرآنِ کریم نازل ہوا، ''گھریلو زندگی'' اور ''شہری زندگی'' کے اصول وضوابط بتلائے اور ہر ایک کے لیے گھریلو اور بیرونی زندگی کے اسلوب و حدود مقرر کیے، اور ''تدبیرِ منزل'' اور ''سیاستِ مَدَنِیَّہ'' میں صغیرہ وکبیرہ گناہوں کی تعیین فرمائی تاکہ ان سے بچ کر اور مامورات پر عمل پیرا ہوکر انسان اپنی آخرت سنوار سکے۔

اسلوبِ آیات در احکام

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں نماز سے متعلق احکام کی آیات میں اختصار وایجاز کا اسلوب اختیار فرمایا ہے جس کے لیے ''اقامت صلاۃ'' کا جامع لفظ استعمال فرمایا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اقامتِ صلاۃ'' کی عملی وقولی تشریح فرمائی کہ نماز کے لیے مسجد بنائی جائے، مسلمان جماعت بنا کر ایک امام کے پیچھے، مسجد میں، اذان دے کر نماز کے مقررہ اوقات میں، پانچ مرتبہ دن بھر میں، خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کریں، احکام کی آیتوں میں ''زکوٰۃ'' کو قرآن میں بیان کرنے کے لیے اجمالی اسلوب اپنایا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کا نصاب، بکری، گائے، اونٹ اور سونا چاندی میں زکوٰۃ کی مقدارِ نصاب کی تعیین اور مستحقین زکوٰۃ کی صاف صاف توضیح فرمائی، روزے کے بارے میں احکام کی آیات اختصار وصراحت کے انداز و

اسلوب میں اتریں جن کا سورۂ بقرہ میں ذکر ہے، کچھ باتیں حج سے متعلق سورۂ بقرہ میں بھی ہیں، سورۂ بقرہ اور سورۂ انفال میں ''جہاد'' کا ذکر ہے، جہاد کا کچھ تذکرہ متفرق طور پر مختلف سورتوں میں آیا ہے، ''مائدہ'' اور ''نور'' نامی سورتوں میں ''حدود اللہ'' کا ذکر ہے، ''سورۂ نساء'' میں میراث کے مسائل واحکام بیان کیے گیے ہیں (جن کو قرآنِ کریم کی صرف تین آیات میں نہایت جامعیت کے ساتھ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ سارے مسائلِ میراث کی بنیاد انہیں آیتوں پر ہے) اسی طرح نکاح، طلاق، خلع وغیرہ سے متعلق احکام کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ''سورۂ طلاق'' ''سورۂ نساء'' اور ''سورۂ بقرہ'' میں اصولی اسلوب میں فرمایا ہے، یہ تمام آیات علم الاحکام اور مضامین احکام سے متعلق ہیں جن کو علمائے اصولِ فقہ نے شمار فرما کر پانچ سو آیات تک پہنچایا ہے۔

(الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، اصطلاحات تفسیر: ۲۱-۲۳)

(۲) علم الجدل : حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ان مضامین کو علم الجدل سے تعبیر فرمایا ہے جن میں قرآنِ کریم نے مشرکین، منافقین اور یہود ونصاریٰ کے عقائد کے سلبی پہلوؤں سے گفتگو کی ہے، اس کا دوسرا نام ''علم المخاصمہ'' بھی ہے۔

اسلوب آیات

علم المخاصمہ یا علم الجدل سے متعلق جو قرآن کی آیات ہیں ان کا اسلوب مشرکین، منافقین، یہود اور نصاریٰ کے عقائد کی تردید کے لیے ہر ایک فرقے کے تئیں جدا جدا ہے، عمومی طور پر آیات الجدل کا پورے قرآن میں دو اسلوب ہے:

(۱) پہلا طریقہ یا اسلوب آیاتِ مخاصمہ کا یہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے باطل عقائد بیان کرتے ہیں، پھر ان کی قباحت ذکر کرتے ہیں، بعد ازاں ان عقائد کے اپنی طرف سے نہ ہونے کو بیان فرماتے ہیں۔

(۲) آیات الجدل والمخاصمہ کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے کافروں کے بے بنیاد شبہات کو بیان کرتے ہیں پھر دلیلِ برہانی یا دلیلِ خطابی کے ذریعے ان کا جواب دیتے ہیں۔

چار فرقوں سے مجادلہ

اللہ تعالیٰ نے اصولاً چار فرقوں سے مجادلے کا حکم دیا ہے: (۱) مشرکین (۲) منافقین (۳) یہود (۴) نصاریٰ

مشرکین سے مجادلے کا اسلوب

اللہ تعالیٰ نے جن آیتوں میں مشرکین سے مجادلے کا ذکر فرمایا ہے، ان میں مشرکین سے مجادلے کے تین اسلوب بیان فرمائے ہیں:

(۱) مشرکین سے ان کے عقائد پر دلیل مانگی جائے، اگر وہ اپنے اسلاف کی تقلید کو دلیل بنائیں تو اسے توڑا جائے۔

(۲) اللہ تعالیٰ اور مشرکین کے اسلاف کے درمیان فرق او رعدم تساوی کو ثابت کیا جائے۔

(۳) توحید پر تمام انبیائے کرام کا اجماع ہے، اس کو بیان کر کے مشرکین کے شرک کو باطل کیا جائے۔

منافقین سے جدل

نفاق کی دو قسمیں ہیں: (۱) نفاقِ عملی (۲) نفاقِ اعتقادی

(۱) نفاقِ عملی یہ ہے کہ آدمی اسلام میں دل سے داخل ہو، لیکن اعمالِ اسلام میں کمزور ہو۔

(۲) نفاقِ اعتقادی یہ ہے کہ آدمی اسلام میں دل سے داخل نہ ہو، دل میں کفر رکھے اور ظاہر میں اسلام، نفاقِ عملی سے آدمی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے اور مرنے کے بعد نفاقِ عملی کی

سزا بھگتنے کے لیے دوزخ میں جائے گا، پھر سزا پوری ہونے پر جنت میں داخل ہوگا، لیکن نفاقِ اعتقادی کی سزا یہ ہے کہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا ''فی الدرک الاسفل'' والی سزا نفاقِ اعتقادی کی قرآن میں مُصرَّح ہے۔

منافقین سے مخاصمہ ومجادلہ کرنے کے لیے قرآن میں جو بھی آیات آئی ہیں ان کا دو اسلوب ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ نے ایسی آیات میں منافقین کے باطل خیالات کو بیان کیا ہے، ان کی برائی بیان کر کے ان سے اظہار نفرت فرمایا ہے۔

(۲) دوسرا اسلوب یہ ہے کہ منافقین کے شبہات کو ذکر فرما کر ان کو دلائل سے ختم کیا ہے۔ (اصطلاحات اصول تفسیر: ۲۹-۳۱)

یہود سے جدل کا اسلوب

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' میں یہودیوں کو ان کے باطل عقائد سے ہٹا کر صحیح عقائد کی طرف لانے کے لیے قرآن کریم میں جو اسلوب بیان کیا گیا ہے اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''یہودیوں کو ان کی 'برائیوں' سے ہٹا کر اسلام پر لانے کا عمل ''جدل'' کہلاتا ہے، جس کے دو اسلوب ہیں:

(۱) یہودیوں کے عقائد کی قباحتوں کا ذکر

(۲) دلائل سے یہودیوں کے شبہات کا دفاع

(اصطلاحات اصول تفسیر، مستفاد، الفوز الکبیر)

حضرت شاہ صاحبؒ نے ''الفوز الکبیر'' میں یہودیوں کی سات برائیاں بیان فرمائی ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:

(۱) توریت پر ایمان رکھنے کے ساتھ تحریفِ لفظی وتحریفِ معنوی کا ارتکاب۔

(۲) توریت کو آسمانی کتاب مانتے ہوئے اس کی ''آیات'' کو چھپالینا۔

(۳) اپنی طرف سے بنا کر کوئی حکم توریت میں شامل کر دینا۔

(۴) احکامِ توریت کی تنفیذ میں کوتاہی۔

(۵) اپنے باطل دین کی حتی المقدور پشت پناہی۔

(۷) خدا اور رسول دونوں کی شان میں گستاخی۔

(۷) بخل وحرص کا عادی ہونا۔

شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم فاروقی محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) نے ان تمام برائیوں کی تفصیل کرتے ہوئے تمام برائیوں پر طویل کلام فرمایا ہے اور ان تمام برائیوں اور عقائدِ باطلہ کو ختم کرنے کے لیے قرآنی آیات کے اسلوب کو دو میں منحصر فرمایا ہے جس کا ذکر ابتدائے بحث میں آیا ہے۔

نصاریٰ سے جدل کا اسلوب

نصاریٰ کے عقائدِ باطلہ میں سب سے اہم اور باطل عقیدہ ''عقیدۂ تثلیث'' ہے جس کی ایسی جبری تشریح کرتے ہیں جس سے خود کو موحد ثابت کرتے ہیں۔ دوسرا اہم باطل عقیدہ ''عقیدہ کفارہ'' ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام سولی پڑ چڑھ گیے اپنی جان، جاں آفریں کے سپرد کر کے تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔

قرآنِ کریم نے ان باطل عقائد کو ختم کرنے کے لیے ایک تو دلیلِ برہانی کو استعمال فرمایا ہے جس میں وہ قیاس استعمال ہوتا ہے جو یقینیات سے مرکب ہو۔ اور دوسرا اسلوب یہ اختیار فرمایا ہے کہ مقبول مقدمات سے مرکب ایسا قیاس ہوتا ہے جس کا

نتیجہ مقبول ہوتا ہے ایسی دلیل کو ''دلیل خطابی'' کہا جاتا ہے۔ ایک اسلوب ان کے باطل عقائد پر تیشہ زنی کے لیے یہ بھی اپنایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ باطل عقائد اور اس کی قباحت ذکر فرما کر یہ بتلاتے ہیں کہ میں نے تو اس کا حکم نہیں دیا تھا پھر بھی انہوں نے اس کو عقیدہ بنالیا۔

(۳) علم التذکیر بآلاء اللّٰہ : اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی گمراہی کا قلع قمع کرنے کے لیے قرآن کریم میں ایسی بے شمار آیات نازل فرمائی ہیں جو خداوندِ قدوس کی نعمت اور واقعاتِ قدرت سے متعلق ہیں، یہ واقعات ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہر شہری، دیہاتی، عربی، عجمی اور متوسط ذہن رکھنے والا بآسانی سمجھ کر، منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے اور خدا کی توحید اور رسول کی رسالت کا اسے علم الیقین حاصل ہو جاتا ہے، ان آیات میں ایسی باتیں نہیں ہوتیں جنہیں صرف فلاسفہ اہلِ علم اور پیچیدہ مسائل سمجھنے والے ہی سمجھیں یا ایسی نعمتیں ذکر ہوں جو بادشاہوں تک محدود ہوں، ایسی آیاتِ قرآنیہ کا مضمون، علم التذکیر بآلاء اللہ کی اصطلاح سے بھی جانا جاتا ہے جسے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے استعمال فرمایا ہے۔

ایسی آیات جن کا تعلق علم التذکیر بآلاء اللہ سے ہے، ان میں قدرتِ خداوندی، آسمان و زمین کی تخلیق، چاند سورج، ستارے، سیاروں کی تسخیر، آسمان کا بغیر ستون کے بنانا، آسمان میں کوئی شگاف نہ ہونا، زمین پر چلنا پھرنا، اس میں راستے ہونا، زراعت و کاشت کاری اور زمین میں بے شمار دفینے وغیرہ کا بیان ہوتا ہے، یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جنہیں ہر خاص و عام جانتا اور سمجھتا ہے۔

اسی طرح بادل سے پانی برسنا، زمین سے چشمے پھوٹنا، پھل فروٹ، غلہ جات، پھول پھلواریاں، صنعت و حرفت کے طریقوں کو دلوں میں ڈالنا، یہ ساری چیزیں اسی قادرِ مطلق کی صناعی، قدرت و کاریگری اور علم و ارادے کی کرشمہ سازیاں ہیں جن کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔

(۴) علم التذکیر بایام اللّٰہ : اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی آیات کا ایک معتد بہ حصہ، ان واقعات و نصائح سے وابستہ کر رکھا ہے، جن میں خدا کے بندوں پر کسی نعمت کے نزول کا، کسی قوم پر عذاب و سزا کا، یا اطاعت شعار بندوں کو نوازے جانے کا ذکر ہوتا ہے، ایسی آیات اور ان کا مضمون علم التذکیر بایام اللہ سے متعلق ہوتا ہے۔

بالخصوص ان واقعات کا ذکر ہوتا ہے جو اہلِ مکہ اور عربوں میں ایک عرصے سے مشہور و منقول چلے آرہے تھے مثلاً: قومِ عاد و قومِ ثمود وغیرہ کا ذکر، انعام یافتہ لوگوں میں بنی اسرائیل کے نبیوں کا ذکر فرمایا ہے۔ حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہم السلام کے قصوں کو ذکر فرمایا ہے۔ قرآن میں انہیں قصوں کا ذکر آیا ہے جن سے عرب کے لوگ مانوس تھے، فارس کی جنگیں، رستم، اسکندر اور دارا کے واقعات، ہندوستان کی لڑائی، مہابھارت کے حالات وغیرہ عربوں میں نامانوس تھے، اس لیے ان کا ذکر نہیں فرمایا۔

مکرر آنے والے قصے

حسبِ ذیل قصے قرآنِ کریم میں مکرر آئے ہیں:

(۱) حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا قصہ

(۲) حضرت نوحؑ (۳) حضرت ہودؑ

(۴) حضرت صالحؑ (۵) حضرت ابراہیمؑ

(۶) حضرت لوطؑ (۷) حضرت شعیبؑ

(۸) حضرت موسیٰؑ (۹) حضرت داؤدؑ
(۱۰) حضرت سلیمانؑ (۱۱) حضرت ایوبؑ
(۱۲) حضرت یونسؑ (۱۳) حضرت زکریاؑ
(۱۴) حضرت عیسیٰؑ
(۱۵) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات

ایک یا دو بار آنے والے قصے

حسبِ ذیل قصے صرف ایک بار یا دو بار قرآن میں مذکور ہوئے ہیں:

(۱) حضرت ادریسؑ کا قصہ۔
(۲) حضرت ابراہیمؑ کی توحید پر نمرود سے گفتگو، صرف ایک جگہ قرآن میں آئی ہے۔
(۳) حضرت یوسفؑ کی عفت کا قصہ۔
(۴) حضرت موسیٰؑ کی ولادت، دریائے نیل میں ڈالا جانا، قبطی کا قتل، مدین جانا، وہاں شادی کرنا، درخت پر آگ دیکھنا، کلام خداوندی کو ہر سمت سے سننا۔
(۵) حضرت موسیٰؑ و خضرؑ کی ملاقات۔
(۶) طالوت و جالوت کا قصہ۔
(۷) ملکۂ سبا بلقیس کا قصہ۔
(۸) ذوالقرنین۔
(۹) اصحابِ کہف والرقیم۔
(۱۰) آپس میں آخرت کے موضوع پر گفتگو کرنے والے دو آدمیوں کا قصہ۔
(۱۱) باغ والوں کا قصہ۔
(۱۲) تین پیغمبروں کا قصہ۔
(۱۳) اس مومن کا قصہ جس کو کافروں نے شہید کر ڈالا۔
(۱۴) اصحابِ فیل۔
(۱۵) اصحاب الاخدود کا قصہ۔

قصوں کا مقصد

وہ آیات جن میں یہ سارے قصے آئے ہیں اور ان کا تعلق ''علم التذکیر بایام اللہ'' سے ہے ان کا مقصد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی زبانی مندرجہ ذیل ہے:

(۱) کفر و شرک سے بیزاری پیدا ہو (۲) معاصی سے توبہ کی توفیق ہو (۳) اللہ کے عقاب سے خوف ہو (۴) خدا کی نصرت پر یقین آئے (۵) اور انعامات خداوندی سے قلبی اطمینان و سکون حاصل ہو۔ (مستفاد: الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، اصطلاحات اصول تفسیر از راقم سطور: ۵۰-۵۳)

(۵) علم التذکیر بالموت و مابعد الموت :

قرآنِ کریم کا ایک معتد بہ حصہ، ان حالات و واقعات پر مشتمل ہے جن میں مرنے کا تذکرہ، مرنے کے بعد آنے والے احوال، موت کی کیفیت، جنت و جہنم کی منظر کشی اور عذاب کے فرشتوں کا نظر آنا وغیرہ وغیرہ بیان کیے جاتے ہیں۔ ایسے مضامین و احوال پر مشتمل آیات کے ذریعے خدا سے برگشتہ بندوں کو نصیحت کرنا مقصود ہوتا ہے، تاکہ وہ اسلام کے سایے تلے آکر اپنی اخروی و ابدی زندگی سنوار لیں، اس طرح کی آیات کا نام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی اصطلاح میں ''علم التذکیر بالموت و مابعدہ'' ہے۔

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''قیامت کی علامتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قربِ قیامت آسمان سے نزول ہے، دجال بھی نکلے گا،

جس کو عیسیٰؑ قتل کریں گے، دابۃ الارض کا نکلنا، یاجوج ماجوج کا خروج، بے ہوشی کا صور پھونکنا، میدانِ حشر میں جمع ہونے کے لیے قبروں سے نکلنا، سوال و جواب، میزانِ عمل، اعمال ناموں کا دائیں یا بائیں ہاتھ میں ملنا، اہلِ ایمان کا جنت میں داخلہ، کافروں کا دوزخ میں جانا، پھر اہلِ دوزخ کا آپس میں مخاصمہ و مباحثہ، ایک دوسرے کو لعن طعن، ان تمام باتوں سے متعلق آیتوں کو ''علم التذکیر بالموت و مابعد الموت'' کہتے ہیں۔ اسی طرح اہل ایمان کو بالخصوص دیدارِ خداوندی سے شرف یاب ہونا، طرح طرح کی جنت کی نعمتیں پانا، حور و قصور سے لطف اندوزی، دودھ و شہد کی نہروں سے فیض یابی، نرم و نازک موٹے اور باریک ریشمی لباس میں ملبوس جنت کی عورتوں سے لطف اندوزی اور فرحت بخش جنتی محفل، اور انواع و اقسام کے لذیذ ترین سوکھے اور گیلے میوؤں کا بے بدل مزہ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی مرحمت فرمائے۔ آمین! جن آیات میں اس کے تذکرے ہوں وہ آیات ''علم التذکیر بالموت و مابعد الموت'' پر مشتمل ہوتی ہیں۔ (مستفاد: الفوز الکبیر، اصطلاحات اصول تفسیر: ۵۴، ۵۵)

اعجاز القرآن

اعجازِ قرآن کے سلسلے میں ''بنیادی طور پر دو باتیں سامنے رکھنی ضروری ہیں:

ایک تو یہ کہ فصاحت و بلاغت اور کلام کی سحر انگیزی ایک ایسی صفت ہے جس کا تعلق سمجھنے اور محسوس کرنے سے ہے اور پوری حقیقت و ماہیت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں، آپ تلاش و جستجو اور استقرا کے ذریعے فصاحت و بلاغت کے اصول و قواعد مقرر فرما سکتے ہیں، لیکن درحقیقت ان اصول و قواعد کی حیثیت فیصلہ کن نہیں ہوتی، کسی کلام کے حسن و قبح کا آخری فیصلہ ذوق اور وِجدان ہی کرتا ہے، جس طرح ایک حسین چہرے کی کوئی جامع مانع تعریف نہیں کی جاسکتی، جس طرح ایک خوش رنگ پھول کی رعنائیوں کو الفاظ میں محدود نہیں کیا جاسکتا، جس طرح مہکتی ہوئی مشک کی پوری کیفیت بیان کرنا ممکن نہیں، جس طرح ایک خوش ذائقہ پھل کی لذت و حلاوت الفاظ میں نہیں سما سکتی، اسی طرح کسی کلام کی فصاحت و بلاغت کو تمام و کمال بیان کر دینا بھی ممکن نہیں، لیکن جب کوئی صاحبِ ذوق انسان اسے سنے گا تو اس کے محاسن و اوصاف کا خود بخود پتہ چل جائے گا۔

دوسرے یہ کہ فصاحت و بلاغت کے معاملے میں ذوق بھی صرف اہلِ زبان کا معتبر ہے، کوئی شخص کسی غیر زبان میں خواہ کتنی مہارت حاصل کر لے، لیکن ذوقِ سلیم کے معاملے میں وہ اہلِ زبان کا کبھی ہمسر نہیں ہوسکتا۔ اب ذرا زمانۂ جاہلیت کے اہلِ عرب کا تصور کیجئے، خطابت و شاعری ان کے معاشرے کی روحِ رواں تھی، عربی شعر و ادب کا فطری ذوق ان کے بچے بچے میں سمایا ہوا تھا، فصاحت و بلاغت ان کی رگوں میں خونِ حیات بن کر دوڑتی تھی، ان کی مجلسوں کی رونق ان کے میلوں کی رنگینی، ان کے فخر و ناز کا سرمایہ اور ان کی نشر و اشاعت کا ذریعہ سب کچھ شعر و ادب تھا، اور انہیں اس پر اتنا غرور تھا کہ وہ اپنے سوا تمام قوموں کو ''عجم'' یعنی گونگا کہا کرتے تھے۔ ایسے ماحول میں ایک امی (جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک کلام پیش کیا اور اعلان فرمایا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، کیوں کہ: ﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا

الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۱۵)

یہ اعلان کوئی معمولی بات نہیں تھی، یہ دعویٰ اس ذات کی طرف سے تھا جس نے کبھی وقت کے مشہور ادبا و شعرا سے کوئی علم حاصل نہ کیا تھا، کبھی مشاعرے کی محفلوں میں کوئی ایک شعر بھی نہیں پڑھا تھا، اور کبھی کاہنوں کی صحبت بھی نہ اٹھائی تھی، خود شعر کہنا تو درکنار آپ کو دوسرے شعرا کے اشعار تک یاد نہیں تھے، پھر یہی وہ ذات تھی جسے میدانِ فصاحت کے یہ سورما ایک نئے دین کا بانی کہا کرتے تھے، اگر یہ اعلان سچا ثابت ہو جائے تو ان کے آبائی دین کی ساری عمارت منہ کے بل گر پڑتی اور ان کی صدیوں پرانی رسوم و روایات کا سارہ پلندہ پیوندِ زمین ہو جاتا تھا، اس لیے یہ اعلان درحقیقت ان کی ادبی صلاحیتوں کو ایک زبردست چیلنج تھا، یہ ان کے دین و مذہب پر ایک کاری وار تھا۔ لیکن کیا ہوا؟ اس اعلان کے بعد ان آتش بیان خطیبوں اور شعلہ نوا شاعروں کی محفل میں سناٹا چھا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد قرآن نے پھر اعلان کیا: ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۰ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ج اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ﴾

اس پر بھی بدستور سکوت طاری رہا''۔ اور اس قوم میں جس کی ''کیفیت بقول علامہ جرجانیؒ یہ ہو کہ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ دنیا کے آخری سرے پر کوئی شخص اپنی فصاحت و بلاغت پر غیر معمولی گھمنڈ رکھتا ہے تو وہ اس پر تنقید کرنے اور اپنے اشعار میں چوٹیں کسنے سے باز نہ رہ سکتی تھی''۔ (الرسالۃ الشافیۃ، لعبد القاہر الجرجانیؒ، المطبوعۃ فی ثلاث مسائل فی اعجاز القرآن:۱۰۹، دارالمعارف مصر، بحوالہ علوم القرآن:۲۵۰)

''وہ قرآن کے ان مکرر سہ کرر اعلانات کے بعد بھی چپکی بیٹھی رہے اور اسے دم مارنے کی جرأت نہ ہو؟ یہ کیسے ممکن تھا۔ اس بات کی کوئی تاویل اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ فصاحت و بلاغت کے سورما قرآن کریم کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ چکے تھے'' اور صرف یہی نہیں کہ یہ شعلہ بیان خطیب اور آتش نوا شاعر عاجز آ چکے تھے، بل کہ کلامِ الٰہی کی حیرت انگیز تاثیر کا کھل کر اعتراف بھی کیا۔ ولید بن مغیرہ کے الفاظ اس کے شاہد عدل ہیں جن میں اس نے کہا کہ ''وَاللّٰهِ انّ لِقَوْله الَّذِیْ یَقُوْلُ (محمد) حَلَاوَةً وَ اِنَّ عَلَیْهِ لَطَلَاوَةً ..... وانه لیَعْلُوْ وَ لَایُعْلٰی''۔

(عن البیہقی والحاکم)

الخصائص الکبری للسیوطی:۱/۱۱۳، اور الاتقان:۲/۱۱۷ میں ہے کہ ابوجہل اپنے بھتیجے ولید بن مغیر کو تنبیہ کرنے کے لیے اس کے پاس آیا بھی تو ولید نے جواب دیا ''خدا کی قسم! محمدؐ جو کہتے ہیں، شعر کو اس سے کوئی مناسبت اور مشابہت نہیں ہے''۔

(علوم القرآن:۲۵۱، اخرجہ البیہقی والحاکم عن ابن عباس)

قرآنِ کریم کی سحر آفرینی

قرآنِ کریم کی سحر آفرینی اور اعجازی خصوصیات کو چار عنوانات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) الفاظ کا اعجاز (۲) ترکیب کا اعجاز (۳) اسلوب کا اعجاز (۴) نظم کا اعجاز

(۱) الفاظ کا اعجاز: ''علوم القرآن:۲۵۴/ پر مولانا

محمد تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

''پورے قرآن کریم میں الحمد سے لے کر والناس تک نہ صرف یہ کہ کہیں کوئی ایک لفظ بھی غیر فصیح نہیں ہے بل کہ ہر لفظ جس مقام پر آیا ہے وہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ایسا اٹل ہے کہ اسے بدل کر اسی فصاحت و بلاغت کے ساتھ دوسرا لفظ لانا ممکن ہی نہیں۔ مثلاً: زمانۂ جاہلیت میں موت کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بہت سے عربی الفاظ مستعمل تھے۔

مثلاً: موت، ہلاک، فنا، حتف، شعوب، حسام، منون، سام، قاضیہ، ہمیع، نیط، فود، مقدار، جہاز، قتیم، طلاطل، طلاطلہ، عول، ذام، کفت، جداع، حررہ، خالج۔ لیکن ان میں سے اکثر الفاظ کے پس منظر میں اہلِ عرب کا یہ قدیم نظریہ جھلکتا تھا کہ موت کے ذریعے انسان کے تمام اجزا ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن ''موت کے مفہوم کے لیے قرآن نے مذکورہ چوبیس الفاظ کو چھوڑ کر ایک نیا لفظ اختیار کیا اور عربی زبان کو ایک ایسا خوب صورت، مختصر، جامع اور فصیح لفظ عطا کیا جس سے موت کی حقیقت بھی واضح ہو جائے، اور وہ لفظ ''تَوَفّی'' ہے، جس کے لغوی معنی ہیں ''کسی چیز کو پورا پورا وصول کر لینا''۔ اسی لفظ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ موت ابدی فنا کا نام نہیں، بل کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح قبض کرنے کا نام ہے'' اللہ تعالیٰ جب چاہے دوبارہ منتشر اجزا کو یکجا فرما کر روح کو لوٹا سکتا ہے، موت کے لیے یہ لفظ سب سے پہلے قرآن ہی نے استعمال کیا ہے۔ ابن سیدہ اندلسیؒ نے مذکورہ تمام نام شمار کرائے ہیں اور اہلِ عرب کے اشعار سے اس کی مثالیں دی ہیں لیکن ''توفی'' کے لیے دلیل میں قرآن کی آیت پیش کی ہے۔ (المخصص ابن سیدہ اندلسی: ۶/۱۱۵، مستفاد: علوم القرآن: ۲۵۵)

(۲) ترکیب کا اعجاز: بعض الفاظ مفرد استعمال ہونے کی شکل میں فصاحت کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے تو قرآن کریم نے ایسے الفاظ کے استعمال سے گریز کا راستہ اپنایا ہے، لیکن جہاں کسی ضروری معنی کی ادائیگی کے لیے نسبتاً غیر فصیح لفظ کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے وہاں قرآن کریم کی ترکیبِ اعجاز قابلِ دید ہے، مثلاً: ارض کی جمع ارضون کو قرآن کریم کی فصاحت کے معیار سے فروتر مانا گیا ہے جس کو قرآن نے الم سے والناس تک کہیں بھی استعمال نہیں کیا ہے، لیکن ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو سات آسمان کی طرح سات زمینوں کی خبر دینا چاہا تو ''سَبْعَ أَرْضِيْنَ'' کی جگہ ''وَ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهن'' کی اعجازی ترکیب استعمال فرمائی۔ بعض مقامات پر یہ وہی غیر فصیح لفظ ترکیب میں اعجازی اسلوب کا حامل بن جاتا ہے، جیسے کہ ''ضیزی'' کا لفظ ایسی سحر آفریں اور معجز بیاں ترکیب قرآنی کے ساتھ، خدا کی لازوال کتاب میں آیا ہے کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ اس سے بہتر نغمگیں کیفیت پیدا کرنے کی صلاحیت سے گویا عاری ہے، اردو زبان میں بھی اس کی مثال پائی جاتی ہے، مثلاً ''منجملہ .....کا لفظ بذات خود بہت اچھا نہیں معلوم ہوتا لیکن جگر مرادآبادی نے اپنے شعر میں اس کو ایسی ادبی روانی و سلیقہ مندی سے استعمال کیا ہے کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ وہ ترنم آفرینی کی صلاحیت رکھتا ہی نہیں۔ شعر یہ ہے ؎

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام پیمانہ مجھے

غالبؔ کا ایک شعر بھی اسی صفت کا حامل ہے ۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

اس شعر میں ''دھول دھپا'' ترکیب کی اعجازی کیفیت کو بتلا رہا ہے۔

جب اردو زبان میں ترکیب کا اعجاز ہم محسوس کر سکتے ہیں تو عربی زبان کا کیا کہنا، وہ تو قرآنِ کریم کی زبان ہے، سیکڑوں زبانوں کے خالق نے تمام کائنات کی زبانوں کو چھوڑ کر اپنے آخری کلام کے لیے اس زبان کو اپنایا ہے تو اس کی اعجازی کیفیت کہاں زبان وقلم کے دائرے میں آسکتی ہے۔ عربوں کو اس کا اعتراف کرنا پڑا، اور قرآن کریم کی زبان کے سامنے بے بس ہوگیے۔

قرآن کریم نے ترکیب کا جو اعجاز اپنے مخصوص مضامین میں برتا ہے اس میں، مشتے نمونہ از خروارے کی قبیل سے ایک مثال ملاحظہ فرمائیں جس سے قرآن کریم کے ترکیبی اعجاز کا اوجِ کمال پر ہونا، جملوں کے دروبست کا پُرشکوہ ہونا۔ سلاست و شیرینی اور فصاحت و بلاغت کے سب سے اعلیٰ معیار پر ہونا معلوم ہوتا ہے۔

''قاتل سے قصاص لینا اہلِ عرب میں بڑی قابل تعریف بات تھی، اور اس کے فوائد ظاہر کرنے کے لیے عربی میں کئی مقولے مشہور تھے، مثلاً: **اَلْقَتْلُ إِحْيَاءٌ لِلْجَمِيْعِ** – قتل اجتماعی زندگی ہے۔ اور **اَلْقَتْلُ أَنْفَى لِلْقَتْلِ** – قتل سے قتل کی روک تھام ہوتی ہے۔ اور **أَكْثِرُوا الْقَتْلَ لِيَقِلَّ الْقَتْلُ** – قتل زیادہ کرنا تاکہ قتل کم ہو جائے۔ ان جملوں کو اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ یہ زبان زد (خاص و) عام تھے، اور فصیح سمجھتے جاتے تھے، قرآن کریم نے اسی مفہوم کو ادا فرمایا لیکن کس شان سے!؟ ارشاد ہے: **وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ** – اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ اس جملہ کے اختصار، جامعیت، سلاست، شوکت اور معنویت کو جس پہلو سے بھی دیکھئے بلاغت کا معجز شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ اور پہلے کے تمام جملے اس کے آگے سجدہ ریز دکھائی دیتے ہیں۔ (علوم القرآن: ۲۵۹)

(۳) اسلوب کا اعجاز: قرآن کریم ایک سحر آفریں، حقیقت پر مبنی مضامین کی حامل کتاب ہے، جس کا اعجاز سب سے زیادہ روشن انداز میں دیکھنا ہے تو اسلوبِ قرآن کا مطالعہ کریں، اس کے اسلوب کی اہم معجزانہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) قرآن کریم ایک ایسی نثر پر مشتمل ہے جس میں شعر کے قواعد وضوابط ملحوظ نہ ہونے کے باوجود ایک ایسا لذیذ اور شیریں آہنگ پایا جاتا ہے جو شعر سے کہیں زیادہ حلاوت ولطافت کا حامل ہے۔

(۲) علاوہ ازیں علائے بلاغت نے اسلوب کی تین قسمیں قرار دی ہیں: (۱) خطابی (۲) ادبی (۳) علمی

ان تینوں قسموں کے دائرے الگ الگ ہیں، ہر ایک کی خصوصیات جدا اور مواقع مختلف ہیں اور ایک ہی عبارت میں ان تینوں اسالیب کو ساتھ لے کر جمع کر دینا ممکن نہیں ہے۔ لیکن قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ان تینوں اسالیب کو ساتھ لے کر چلتا ہے، اس میں خطابت کا زور، ادب کی شگفتگی اور علم کی متانت ساتھ ساتھ چلتی ہے اور کسی چیز میں کوئی کمی نہیں آنے پاتی۔

(۳) قرآن کریم کے مخاطب الّھڑ دیہاتی بھی ہیں، پڑھے لکھے لوگ بھی، اور اعلیٰ درجے کے علما اور ماہرین فنون بھی، لیکن اس کا ایک اسلوب بیک وقت تینوں طبقوں کو یکساں متاثر کرتا ہے، ایک طرف اَن پڑھ آدمی کو اس میں سادہ حقائق ملتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ قرآن میرے ہی لیے اترا ہے، لیکن دوسری طرف علما اور محققین جب اسے گہری نظر سے پڑھتے ہیں تو ان کو قرآن کریم میں علمی نکات اور علم وفن کی باریکیاں نظر آتی ہیں۔

(۴) اگر ایک ہی بات بار بار دہرائی جائے تو کہنے والا چاہے جتنا بڑا ادب شناس اور فنی رموز سے واقف ہو ایک ایسا مرحلہ ضرور آتا ہے کہ اس کی بات سننے والا اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے، لیکن قرآن کریم کا معاملہ بالکل نرالا ہے، قرآن کریم میں بعض مرتبہ ایک ہی بات بیسیوں مرتبہ کہی گئی ہے، پھر بھی ہر مرتبہ نئی لذت، نیا کیف اور نئی تاثیر محسوس ہوتی ہے۔

(۵) کلام کا پُر جلال و پُر شکوہ اور شیریں ونرالا ہونا دو متضاد صنفیں ہیں جن کے لیے الگ الگ اسلوب اپنانا پڑتے ہیں، لیکن قرآن کریم کے اسلوب کا یہ اعجاز ہے کہ دونوں اوصاف ایک ہی جگہ بدرجۂ کمال پائے جاتے ہیں۔

(۶) قرآن کریم نے بعض ان مضامین کو بلاغت کے اوج کمال تک پہنچا کر دکھایا ہے جن میں کوئی بشری ذہن ہزار کوشش کے بعد بھی کوئی ادبی چاشنی پیدا نہیں کرسکتا، مثلاً قانونِ وراثت کو لیجئے یہ ایک ایسا خشک اور سنگلاخ موضوع ہے کہ اس میں دنیا کے تمام ادیب مل کر بھی ادبیت اور عبارت کا حسن پیدا نہیں کرسکتے لیکن سورۂ نساء میں ''یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ الخ'' والے رکوع کی تلاوت کیجئے آپ بے ساختہ پکار اٹھیں گے یہ کوئی غیر معمولی کلام ہے جس کے حسن و جمال پر ذوق سلیم وجد کرتا ہے۔

(۷) ہر شاعر و ادیب کا میدانِ فصاحت و بلاغت مخصوص ہوتا ہے لیکن قرآن کریم فصاحت و بلاغت کے تمام میدانوں میں اعلیٰ ترین معیار رکھتا ہے، ترغیب ہو یا ترہیب، وعدہ ہو یا وعید، پند و نصیحت ہو یا احکام و امثال، قصص و عقائد ہوں یا اقوام ماضیہ کے عبرت انگیز واقعات، قرآن کا بیان کہیں بھی پھیکا نہیں پڑتا۔

(۸) اختصار و ایجاز قرآن کریم کے اسلوب کا نمایاں وصف ہے، توحید و رسالت اور آخرت کے کلیدی موضوعات پر مشتمل ہونے کے باوجود چند جملوں میں تاریخ، قانون، سیاست، جہاں بانی، فلسفہ اور سائنس، عمرانیات و معاشیات پر ایسی جامع ہدایات دے دی ہیں کہ دنیا کے علوم فنون سیکڑوں ٹھوکریں کھانے کے بعد آج ان کے قریب قریب پہونچے رہے ہیں۔ (مستفاد: علوم القرآن: ۲۶۴، ۲۴۵)

(۴) نظم کا اعجاز: قرآنِ کریم کا ایک اعجاز جو دقیق بھی ہے اور معنی خیز بھی، وہ قرآنِ کریم کی آیتوں کا باہمی ربط وتعلق ہے۔

اس سلسلے میں علمائے تفسیر کی ۲/ رائیں ہیں: ایک رائے تو یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات اور اس کے ٹکڑے مختلف مواقع پر نازل ہوئے تو ان کے درمیان باہمی ربط وتعلق تلاش کرنا مناسب نہیں بل کہ قرآن کریم کا ایک اعجاز یہی ہے کہ باہمی بے ربطی ہی کبھی ہزار ربط وتعلق سے بہتر ہوتی ہے، ''جس طرح قدرتی مناظر میں کوئی ربط اور ترتیب نہیں ہوتی، بل کہ ان کا حسن ہی اس بے ترتیبی میں ہوتا ہے کہ کہیں بل کھاتا ہوا دریا

ہے، کہیں ناہموار پہاڑ ہے، کہیں اونچی نیچی وادیاں ہیں''۔

دوسری رائے یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی آیات میں بہت لطیف ربط ہے، جو از اول تا آخر پورے قرآن میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ کی تفسیر کبیر اس سلسلے کی شاید نہیں یقیناً سب سے زیادہ قابلِ تعرف کاوش ہے، جس میں نظم قرآن کے اعجاز کو خاص سلیقہ مندی اور خاص توفیق ایزدی سے بہترین تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، قاضی ابوالسعود رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''صفوۃ التفاسیر'' میں نظمِ قرآن کے اعجازی پہلو کو خصوصیت کے ساتھ اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش فرمائی ہے۔

علومِ تفسیر سے دوری

عالم گیر تاریکی کو چھانٹنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جب اتنی عظیم کتاب اتاری جو مضامین کے لحاظ بھی ایک مکمل کتاب ہے، اور فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے بھی اوج کمال پر پہونچی ہوئی ہے، تو ایسے عالم میں اس کتاب کی صحیح تفسیر اور مستند تشریح کے لیے اس کا اہل ہونا ضروری ہے، اور علمائے امت نے قرآن وحدیث کی روشنی میں جن اصول واصطلاحات کو صحیح تفسیر تک رسائی کے لیے لابدی قرار دیا ہے، ان سے واقفیت ضروری ہے، یہی علوم تفسیر کے وہ بنیادی فنون ہیں جن سے دوری کی وجہ سے تفسیر میں نوع در نوع گمراہیاں در آئی ہیں، اور جو جدید مفسرین نے تفسیر بالرائے کی وہی راہ اختیار فرمائی ہے، جس سے صاحبِ وحی نے صراحتاً منع فرمایا تھا، اور یہاں تک ارشاد فرمایا تھا کہ: ''مَنْ تَكَلَّمَ فِيْ الْقُرْآنِ بِرَأيه فَأَصَابَ فَأَخْطَأ'' اور ''مَنْ قَالَ فِيْ الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ''۔ (علوم القرآن)

اصولِ تفسیر سے انحراف کی صورتیں

قرآنِ کریم کو صحیح تفسیر کے ساتھ سمجھنے کے لیے اس کے مآخذ: قرآن، حدیث، اقوالِ صحابہ، تابعین کے اقوال، لغتِ عرب اور عقل سلیم سے سہارا لیے بغیر تفسیر کی وادی میں رہ نوردی اصولِ تفسیر سے انحراف کہلاتا ہے، جس کو تفسیر بالرائے کہتے ہیں، جس کی مندرجہ ذیل شکلیں ہیں:

(۱) جو شخص تفسیرِ قرآن کے بارے میں گفتگو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا وہ محض اپنی رائے کے بل بوتے پر تفسیر شروع کردے۔

(۲) کسی آیت کی کوئی تفسیر صراحتاً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ وتابعین سے ثابت ہو اور وہ اسے نظر انداز کرکے محض اپنی عقل سے کوئی معنی بیان کرنے لگے، جن آیات میں صحابہ وتابعین سے کوئی صریح تفسیر منقول نہیں، ان میں لغت اور زبان وادب کے اصولوں کو پامال کرکے کوئی تشریح بیان کرے۔

(۳) قرآن وسنت سے براہِ راست احکام وقوانین مستنبط کرنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اس کے باوجود استنباط واجتہاد کرنے لگے۔

(۴) قرآن کریم کی آیات متشابہات کی پورے جزم ووثوق کے ساتھ کوئی تفسیر بیان کرے اور اس پر مصر ہو۔

(۵) قرآنِ کریم کی ایسی تفسیر بیان کرے جن سے اسلام کے دوسرے اجماعی عقائد واحکام مجروح ہونے لگیں۔

(۶) تفسیر کے معاملے میں جہاں عقل وفکر استعمال کرسکتے ہیں وہاں کسی قطعی دلیل کے بغیر اپنی ذاتی رائے کو یقینی طور پر درست قرار دے اور دوسرے حضرات مجتہدین کی آرا کو قطعی طور پر باطل قرار دے۔

مذکورہ بالا تمام صورتوں کو حدیث کے اس مختصر ارشاد میں سمیٹ کر بیان کر دیا گیا ہے: ''مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ'' جو شخص قرآنِ کریم کے معاملے میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

ان تمام باتوں کی تفصیل اصولِ تفسیر کے حوالے سے مولانا بدر الدین زرکشیؒ نے ''البرہان فی علوم القرآن'' میں ''اقسام التفاسیر'' کے عنوان سے ص ۱۶۴ تا ۱۷۰ بیان فرمایا ہے جو قابلِ استفادہ ہے۔

اخیر میں اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو پورے عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنادے، اور اس کے علوم سے پوری دنیا فیضاب ہوتی رہے۔ آمین! ☆☆☆

کتابیات

(۱) قرآن کریم
(۲) صحیح بخاری شریف
(۳) علوم القرآن از مفتی محمد تقی عثمانی
(۴) ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین (عربی) مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندویؒ
(۵) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر (اردو) مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندویؒ
(۶) تاریخ طبری
(۷) ایران بعہد ساسانیاں
(۸) تمدن ہند
(۹) کتاب الاصنام
(۱۰) طبقات الامم
(۱۱) المخصص لابن سیدہ
(۱۲) کتاب الأغانی
(۱۳) الفوز الکبیر فی اصول التفسیر - حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
(۱۴) اصطلاحات اصول تفسیر - مولانا افتخار احمد قاسمی بستوی
(۱۵) الاتقان فی علوم القرآن
(۱۶) مقالات شبلی
(۱۷) البرہان فی علوم القرآن

بیسویں صدی میں
اردو کا سوانحی ادب اور تعمیری قدریں

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صدر رابطہ ادبِ اسلامی

سوانحی ادب بڑا متنوع اور دور رس اثرات کا حامل صنفِ ادب ہے۔ یہ انسان کی گوناگوں شخصی خصوصیات ہے جن سے اس کی انسانی صفات وخصوصیات کا آئینہ بنتا ہے۔ اس میں صاحبِ سوانح اور کاتبِ سوانح دونوں کے ذوقی ونظری اندازِ فکر وخصوصیات باہم ہوجاتے ہیں۔ اور تذکرہ نگار اس میں اپنے فکر اور مشاہدہ اور اپنے ذوق کے لحاظ سے کسی پسندیدہ یا شہرت رکھنے والی شخصیت کے احوال و امتیازات کو ظاہر اور ادا کرتا ہے۔ اس موضوع کا جو علمی حق ہے محتاط اہلِ قلم اس کو اچھی طرح ادا کرتے ہیں، لیکن بعض اہلِ قلم اس کے صحیح حق کو ادا کرنے میں قاصر رہتے ہیں۔ بعض اہلِ قلم اس کو افسانے کا رنگ دے دیتے ہیں، اور بعض اہلِ قلم اسے صاحبِ سوانح کے خیال و رجحانات کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح یہ موضوع مختلف انداز میں سامنے آتا ہے۔ اس میں قاری صرف سوانح ہی کو نہیں پڑھتا، بلکہ اس کے ساتھ راقمِ سوانح کو بھی پڑھ لیتا ہے۔

اسلام میں سوانح نگاری کا آغاز حضور اکرم (ﷺ) کی سیرتِ طیبہ سے ملتا ہے، اور سیرتِ نبوی کی تصنیف کا آغاز مغازی کی احادیث سے ملتا ہے، اور اس کام میں محمد بن اسحاق کا نام اوّلین حیثیت رکھتا ہے۔ انہیں کی روایات کی بنیاد پر ابن ہشام نے حضور (ﷺ) کی سیرتِ طیبہ تیار کی، جو اپنی متعدد خوبیوں کی بنا پر سیرتِ نبوی کے باب میں بہت امتیاز رکھتی ہے اور اس کا اسلوبِ بیان ادبی خوبیوں سے بھی مالا مال ہے۔

عصرِ عباسی کے آغاز کے ساتھ عربوں میں علوم وفنون کی تدوین کا عہد شروع ہوگیا تھا، جس میں ترقی کر کے اس کو ایسے کمال تک پہونچایا، جو اسلامی تاریخ کا درخشاں باب ہے، اس میں شخصیتوں کے حالات قلم بند کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا، اس کی بڑی ضرورت احادیثِ رسول اللہ (ﷺ) کے راویوں کے مقام اور صفات کو جاننے کے لیے ان کی خصوصیات اور زندگی کے اہم حالات کو محفوظ کر دینے سے پڑی، جو اسماء الرجال کے نام سے ایک مستقل فن بن گیا، شخصیتوں کے حالات محفوظ کرنے کا کام طبقات کے عنوان سے رواۃِ حدیث کے علاوہ اہم شخصیات کے لیے بھی کیا جانے لگا، اس میں طبقاتِ ابن سعد کو اوّلین حیثیت حاصل ہے، پھر اہلِ علم کے مختلف گروہوں کے لیے علاحدہ علاحدہ طبقات پر بھی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ ادب کے تعلق سے بھی ممتاز شخصیات کے حالات قلمبند کیے گیے۔ پھر بتدریج اہم ترین شخصیات پر مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں۔ اسی طرح کے مصنفین میں علامہ ابن الجوزی، علامہ یاقوت حموی، امام ذہبی، اور قاضی ابن خلکان کے نام نمایاں ہیں۔

تذکرہ نویسی کا داعیہ بعض وقت اپنی کسی پسندیدہ

شخصیت کی زندگی اور اس کی خصوصیات کو دوسروں کے سامنے لانے کا ہوتا ہے، اور بعض وقت یہ کام صرف علمی اور تحقیقی مقصد سے کیا جاتا ہے۔ اول الذکر صورت میں مصنف اگر پوری احتیاط اور قلمی دیانت سے کام نہ لے، تو سوانح مدح وستائش کے بعض غلو والے پہلوؤں کی حامل بن جاتی ہے، چنانچہ بزرگ شخصتیوں کے بعض تذکروں میں اس طرح کا غلو ملتا ہے، ان کے تذکرہ میں بعض بعض تصنیفیں کرامات اور غیر معمولی اوصاف کے ذکر کی حامل ملتی ہیں، اور بعض میں تو یہ فرق بھی ملنا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ انسان کی واقعی سوانح ہے یا انسان سے مافوق الفطرت کسی دوسری ذات کی۔ لیکن علمی انداز کی پابندی رکھنے کی صورت میں سوانح اپنے قارئین کے لیے کسی ایک شخصیت کا آئینۂ زندگی بن جاتی ہے، جب شخصیت بڑی ہو، اپنی صفات میں ممتاز ہو، اور اس کی زندگی کی تصویر کشی اس کو انسان رکھتے ہوئے ہو، تو وہ سوانح ایک مؤثر اور طاقتور علمی تحفہ ہوجاتی ہے، اور لکھنے والا اگر بیان و زبان کی علمی وادبی رعایتوں کا لحاظ رکھتا ہے تو تذکرہ علمی خوبیوں کے ساتھ ادبی خوبیوں کا بھی حامل بن جاتا ہے۔

اس کی مثال ہر زبان میں ملتی ہے، ہماری اردو زبان بھی اس سے مالا مال ہے، مولانا الطاف حسین حالؔی کی حیاتِ جاوید، خلیق احمد نظامی کی نگاہِ فخر، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کی شہیدِ جستجو۔ اسی طرح ان کے دیگر معاصرین کی تحریر کردہ سوانح عمریاں ہیں، جن میں خاص طور پر علامہ شبلی کی سیرۃ النبی، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النعمان وغیرہ، اور ان کے جانشین علامہ سید سلیمان ندوی کی حیاتِ شبلی، عمر خیام، سیرتِ عائشہ، اور ان کے رفیق اور ساتھی مولانا عبدالسلام ندوی کی اسوۂ صحابہ، سیر الصحابیات، امام رازی، اقبال کامل۔ اور شاہ معین الدین ندوی کی خلفائے راشدین وغیرہ۔ اسی طرح دارالمصنفین کے دیگر منتسبین نے اس میں اچھا لٹریچر پیش کیا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی اس موضوع پر اچھا اور مفید کام رہا ہے، ان کی سیرت سید احمد شہید، تاریخ دعوت وعزیمت، حیاتِ عبدالحی، تذکرہ فضلِ رحمان گنج مراد آبادی اور دوسرے دعاۃ ومصلحین کے تذکروں کو خصوصی مقام حاصل ہے اور فضلائے ندوہ نے اس باب میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے۔

سیرتِ نبوی بھی اگرچہ ایک سوانح ہے، لیکن اس کے لکھنے والوں کا تعدد وتنوع اور اس عظیم شخصیت کے اوصاف کی ندرت ورعنائی کی وجہ سے اس حد تک بڑھا ہے کہ وہ سوانح نگاری میں بالکل علاحدہ اور مستقل باب بن گئی ہے۔ اور اب سیرتِ نبوی سوانح نگاری کا جز ہونے کے بجائے خود اپنی علاحدہ حیثیت کی مالک بن گئی ہے، جس پر گذشتہ صدیوں میں برابر کام ہوتا رہا ہے اور برابر جاری ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح مدحیہ شاعری میں نعتیہ شاعری کو علاحدہ فن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، اور اس کو اہلِ فن علاحدہ صنف کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

سوانح نگاری میں خودنوشت سوانح آپ بیتی نے بھی اپنا ایک مستقل مقام بنالیا ہے، اور اس میں چونکہ راوی صرف راوی یا مشاہد نہیں، بلکہ خود اصل ہوتا ہے، اس لیے جو تصویر کشی وہ کرتا ہے، وہ دوسرا نہیں کرسکتا، اور جب آپ بیتی لکھنے والے کا قلم بھی ادب شناس ہو تو بات کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے۔

خودنوشت سوانح میں صاحبِ قلم کے اندازِ فکر وذوق کا اثر بطور خصوصی پایا جاتا ہے، اور خودنوشت سوانح لکھنے والا جب ادیب ہو تو اس کی ادبی خصوصیات زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ اس میں بیان اپنا ہوتا ہے، اور اپنے واقعات وتاثرات کو بہتر تعبیر وزبان

میں ادا کرنے کا اسلوب اپناتا ہے۔انسانوں کے مزاج و احساسات وتأثرات الگ الگ اور متنوع بھی ہوتے ہیں، اور خاص حد تک ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہوتے ہیں، اور تذکرہ وروداد کا بھی فرق ہوتا ہے، اس طریقے سے سوانح نگاری کا فن ایک متنوع اور لطف کا حامل فن بن جاتا ہے۔

سوانح نگاری کے لیے کچھ شرائط ہیں۔اول یہ کہ سوانح نگار واقعات کو ان کے اثرات کے ساتھ پیش کرتا ہو۔دوسرے یہ کہ سوانح نگار زمانے کے بدلتے ہوئے مذاق کے مطابق سوانح کے ان عناصر پر زور دے، جن سے قارئین صاحبِ سوانح کی شخصیت کی خصوصیت سے واقف ہوجائیں۔تیسرے یہ کہ سوانح نگاری میں صاحبِ سوانح کی زندگی کی ایسی تصویر سامنے آئے کہ پڑھنے والا اس سے محظوظ ومستفید ہوسکے۔ بظاہر یہ شرائط سخت ہیں، اور ان کو سوانح نگار کم ہی نباہ سکتا ہے، لیکن اگر وہ تصنع سے کام نہ لے، اور صرف فطری انداز میں بات کہے تو بھی سوانح دلچسپ ہوجاتی ہے۔ کسی ہیرو کا حال بیان کرنے میں یہ لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اس کی شخصیت کے کارہائے نمایاں پر زور دیا جائے، اس کی زندگی کے ان پہلوؤں کا حال تفصیل کے ساتھ بیان کرنا لاحاصل سمجھا جاتا ہے، جو عموماً ہر شخصیت میں پائی جاتی ہیں، جن کے بیان سے قاری کو کچھ فائدہ نہ پہونچے، جو لوگ خود اپنے حالات یا دوسروں کی سوانح ایک خاص نقطۂ نظر سے بیان کرتے ہیں، اور اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر اپنی یا دوسروں کی شخصیت کے خدوخال نمایاں کرتے ہیں، وہ سوانح نگاری کے فنی راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔

سوانح نگاری ایک بڑی ذمہ دار صنفِ ادب ہے۔جن شخصیتوں کے سوانح ماڈل یا نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیے جائیں، ان میں واقعی کوئی بات بھی ایسی ہونی چاہئے کہ پڑھنے والے کو احساس ہو کہ اس شخصیت کے مطالعہ سے اس کی زندگی کی بعض اہم خصوصیات سے واقفیت ہوئی ہے۔ یہی شخصیتیں ہمارے سماج میں ہیرو بن کر ابھرتی ہیں۔ان کا میدانِ عمل خواہ سیاسی ہو، یا روحانی یا ادبی۔

سوانح نگاری کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جن شخصیات کی سوانح پیش کیے جائیں، ان کی محض مدح سرائی ہی نہ ہو، کیوں کہ سوانح نگاری کوئی قصیدہ نگاری نہیں ہے، انسانی زندگی میں غلطیاں اور کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں، جو سامانِ عبرت وبصیرت ہوتی ہیں، یہ کوتاہیاں اگر ظاہر نہ کی جائیں اور معروف شخصیتوں کو ہیرو بنا کر محض ان کو ناقابلِ تقلید مقام پر پہونچایا جائے تو یہ فنِ سوانح نگاری کے ساتھ انصاف کرنا نہ ہوگا۔اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ صاحبِ سوانح کی عظمت کے خصوصی پہلو کو سمجھا جائے اور اس کو مناسب انداز میں ظاہر کیا جائے، کسی بڑے آدمی میں وہ کون سی امتیازی خوبی تھی جس نے ان کو بڑا بنایا، جب تک یہ معلوم نہ ہو اور سوانح نگاری کے ذریعہ اسے عام قارئین تک نہ پہونچایا جاسکے، قارئین کو پورا فائدہ نہیں پہونچتا۔

دراصل انسان انسان ہی سے سیکھتا ہے، پہلے اپنے ماں باپ سے، پھر اپنے ماحول کی بڑی شخصیات سے، جن سے اس کی ملاقات ہوئی اور مشاہدہ کا اس کو موقع ملتا ہے، اس کے بعد اس کے لیے سیکھنے اور اچھے برے کو سمجھنے کے لیے اپنے دائرہ حیات سے ہٹ کر دوسری قابلِ نقل وتقلید شخصیتوں کے تحریر شدہ احوال سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور اس امر کے لیے سوانح عمریاں اور ان کے مشتملات ذریعہ بنتے ہیں۔اس لیے سوانح عمریوں کا موضوع اہم ترین موضوع ثابت ہوتا ہے، جو مختلف زبانوں میں ہوتا ہے، اور ایک زبان سے ترجمہ کرکے دوسری زبان کے لوگوں کے لیے مزید قابلِ استفادہ اور معلومات کا حامل ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔☆☆☆☆

اردو میں خودنوشت سوانح کی روایت

ڈاکٹر تابش مہدی

خودنوشت سوانح نگاری ایک آزاد اور خود مکتفی صنفِ ادب ہے۔ اس کی روایت بہت قدیم ہے۔ خودنوشت ایک ایسی صنفِ ادب ہے، جس میں مصنف یا سوانح نگار اپنے قلم سے اپنی زندگی کے حالات وکوائف اور حوادث وواردات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ حوالۂ قلم کرتا ہے، جس سے سوانح نگار کی زندگی کی مصروفیات، ذاتی دل چسپیوں، نشیب وفراز اور اس کے تدریجی ارتقا کا بخوبی علم ہوتا ہے۔

خودنوشت سوانح نگاری کی روایت دنیا کی تمام زبانوں میں ملتی ہے۔ عربی انگریزی میں اس کے قیمتی نمونے ملتے ہیں۔ ابنِ بطوطہ، جان ایویلینا ور پیپس کی ڈائریوں کو بھی اس میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ رواں صدی کے مشہور ومعتبر ناقد ومحقق شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی تنقیدی رایوں اور تحقیقی افکار کو بڑا اعتبار حاصل ہے۔ انہوں نے ماہنامہ ''نقوش'' لاہور کے آپ بیتی نمبر کی پہلی جلد میں خودنوشت سوانح نگاری پر خیال افروز گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بہ راہِ راست خودنوشت نگاری ناممکن ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان اپنے عیوب کو چھپاتا ہے، اپنے عزیزوں، احباب اور متعلقین کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ خائف رہتا ہے۔ اس صورت میں وہ یا تو بہت کچھ چھپانے اور مخفی رکھنے کی کوشش کرتا ہے یا ہیر پھیر کر اپنی باتوں کو پیش کرتا ہے۔ اور مبالغے سے کام لیتا ہے۔ اپنے برے اور مذموم کاموں پر پردہ ڈالتا ہے اور اپنے بدنما وداغ دار چہرے پر رنگ وروغن مل کر سامنے آتا ہے۔ یہ صورت بہ ہر حال ناپسندیدہ اور قابلِ گرفت ہے۔ سید عبداللہ نے جوش ملیح آبادی کی خودنوشت ''یادوں کی بارات'' کو اسی قبیل کی خودنوشتوں میں شامل کیا ہے۔

یوں تو خودنوشت سوانح نگار کو کئی خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور اس پر تفصیلی گفتگو ہوسکتی ہے، لیکن ہم قلتِ وقت کے پیشِ نظر اس کو تین خانوں میں تقسیم کرکے ان کے تحت لکھی جانے والی خودنوشتوں پر گفتگو کریں گے۔

(۱) خودنوشتوں میں پہلی قسم ان کی ہے، جو مذہبیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ وہ خودنوشتیں ہیں، جن کے لکھنے والے مذہبی لوگ رہے ہیں اور انہوں نے اپنی خودنوشت میں مذہب سے اپنی وابستگی کو نمایاں رکھا ہے۔ اس خانے میں مولانا سید حسین احمد مدنی کی کتاب ''نقشِ حیات'' مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی کتاب ''آپ بیتی'' کے ساتوں نمبر، مولانا عبد الماجد دریابادی کی ''آپ بیتی'' مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کتاب ''کاروانِ زندگی'' کی (ساتوں جلدیں)،

انعام الرحمٰن خاں کی ''زنداں کا داعی'' اور مولانا اعجاز احمد اعظمی کی ''حکایتِ ہستی'' کو رکھا جاسکتا ہے۔

(۲) دوسری قسم ان خودنوشت نگاروں کی ہے، جو اپنی عام زندگی میں ایک سیاسی یا سماجی کارکن کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے رہے ہیں اور انہوں نے اپنی خودنوشت میں اپنی سیاسی اور سماجی حیثیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔اس ذیل میں محمد جعفر تھانیسری کی ''تواریخ عجیب'' ظہیر الدین دہلوی کی ''داستانِ غدر'' نواب احمد سعید خاں چھتاری کی ''''یادِ ایام'' عبدالمجید سالک کی سرگزشت، گوپال متل کی ''لاہور کا جو ذکر کیا''، عبدالغفور نساخ کی ''سوانح عمری'' سید اعجاز حسین کی ''میری دنیا'' رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری'' خواجہ غلام السیدین کی ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں سے'' احسانِ دانش کی ''جہانِ دانش'' کلیم الدین احمد کی ''اپنی تلاش میں''، یوسف حسین خاں کی ''یادوں کی دنیا''، مسعود حسین خاں کی ''ورودِ مسعود'' مشتاق احمد یوسفی کی ''سرگزشت'' جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات'' وامق جونپوری کی ''گفتنی نا گفتنی'' ادا جعفری کی ''جو رہی سو بے خبری رہی'' اور بعض دوسری کتابیں شامل کی جانی چاہئیں۔

مولانا سید حسین احمد مدنی ایک عالمِ دین تھے، درس وتدریس ان کا مشغلہ تھا، انہیں ایک بڑے حلقہ میں مرشدانہ حیثیت حاصل تھی۔ان کے مریدین اور مسترشدین ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ ہندو پاک میں ان کے سیکڑوں تلامذہ، منتسبین اور مریدین موجود ہیں۔ان سب کے ساتھ ساتھ وہ ایک مجاہدِ آزادی بھی تھے۔زمانۂ طالب علمی ہی سے وہ اپنے شیخ واستاذ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی رہ نمائی میں جنگِ آزادی میں حصہ لینے لگے۔اس سلسلے میں متعدد بار انہیں جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ان کی خودنوشت ''نقشِ حیات'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ خود ان کی زندگی کے حالات پر مشتمل ہے اور دوسرے حصے میں زیادہ تر ان کے شیخ ومرشد مولانا محمود الحسن کی علمی مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے۔ اسی وجہ سے بعض ناقدین نے ''نقشِ حیات'' کے دوسرے حصے کو خودنوشت سوانح میں شامل نہیں کیا ہے۔

''نقشِ حیات'' کے پہلے حصے میں مولانا سید حسین مدنی نے بڑی تفصیل سے اپنی ابتدائی واعلیٰ تعلیم، اپنے خاندانی پسِ منظر، اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات ونشیب وفراز اپنے اساتذہ اور بعض وابستگان کا تذکرہ کیا ہے۔ بالعموم خودنوشت سوانح نگار اپنے حسب ونسب اور خاندان کے سلسلے میں مبالغے اور حشو بیانی سے کام لیتے ہیں، لیکن مولانا حسین احمد مدنی نے بڑے دیانت دارانہ انداز میں اپنے شجرۂ نسب پر گفتگو کی ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ میرے والد حبیب اللہ مرحوم صاحبِ اجازت بزرگ تھے۔ وہ بانگرمئو ضلع اناؤ (یوپی) میں ٹیچر تھے۔ وہاں کے لوگ انہیں احتراماً مدرس صاحب کہتے تھے۔ چوں کہ ٹانڈہ (ضلع فیض آباد) کے رہنے والے تھے اور ٹانڈہ بنکروں کی بستی مانی جاتی رہی ہے، اس لیے بانگرمئو اور اس کے مضافات کے لوگ والد صاحب کو بھی جولاہا خیال کرتے تھے۔ یہ بات والد صاحب کے علم میں آئی تو انہیں بڑی تشویش ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے اپنا شجرۂ نسب دریافت کیا، لیکن شجرہ صرف شاہ نورالحق ٹانڈویؒ تک ہی دریافت ہوسکا جن سے ان

کا خاندان دسویں یا گیارہویں پشت میں جاملتا ہے۔اسی تحقیق وجستجو کے دوران میں یہ بھی ہوا کہ ایک دن بانگرمئو میں اپنے وقت کے عظیم بزرگ مولانا شاہ فضلِ رحمان گنج مرادآبادی تشریف لائے۔انہوں نے دورانِ وعظ میں کسی بات کے ذیل میں فرمایا: بھئی! مدرس صاحب تو پیرزادے ہیں۔ان کے مقام اور مرتبے کا کیا ٹھکانہ ہے۔والدِ محترم کو اس بات سے کافی حد تک اطمینان ہوا کہ جب ایک صاحبِ کشف بزرگ نے پیرزادگی کی سند دے دی تو میرے سید ہونے میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے۔تاہم انہیں کامل شرحِ صدر نہیں ہوسکا۔عدمِ شرحِ صدر کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ شاہ نورالحق ٹانڈویؒ کے نام کے ساتھ فارسی میں یہ عبارت بھی درج تھی: ''شاہ نورالحق ٹانڈویؒ درقصبہ ٹانڈہ درشغل قصاری اشتغال می داشت'' (شاہ نورالحق ٹانڈویؒ قصبہ ٹانڈہ میں دھوبی کا کام کرتے تھے)۔ انہیں کامل شرحِ صدر اس وقت ہوا جب انہوں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ وہ کسی تالاب میں نہارہے ہیں، کنارے حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کھڑی ہیں، وہ تیرتے تیرتے کنارے کی طرف جارہے ہیں اور حضرت سیدہ سے متعلق ان کے دل میں وہی جذبات موج زن ہیں، جو کسی بیٹے کے دل میں اپنی حقیقی ماں سے متعلق ہوسکتے ہیں۔ جب وہ نہاکر تالاب سے نکلے تو دیکھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ تشریف فرماہیں۔حضرت حسین نے والد صاحب کو سینے سے لگا لیا اور فرمایا میری اولاد میں سے ہو۔

مولانا محمد زکریا کاندھلوی ایک عالم ومحدث تھے اور بیعت وارشاد کا بھی سلسلہ رکھتے تھے۔ان کی خودنوشت صرف ان کے تلامذہ اور مسترشدین کے لیے تو مفید ہوسکتی ہے لیکن عام قاری کے لیے اس میں کوئی کشش نہیں ہے۔کیوں کہ ان کا دائرہ بہت محدود رہا ہے۔عالمی مسائل سے انہیں کوئی دل چسپی نہیں رہی ہے۔انہوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے:

''الحمد للہ ناکارہ کو اخبار بینی اور کتب خارجیہ کے مطالعے سے ہمیشہ نفرت رہی ہے''۔

ظاہر ہے کہ جو مصنف اخبارات اور غیر درسی کتب سے بے نیاز رہا ہو اور اس حد تک بے نیاز رہا ہو کہ اپنی اس بے نیازی پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہو، اس کے ہاں عام لوگوں کے استفادے کی کیا بات ہوسکتی ہے۔ایک جگہ اور بھی دل چسپ بات لکھی ہے، کہتے ہیں: ''ایک بار مسجد سے میری چپلیں غائب ہوگئیں تو میں نے چھ دن تک نئی چپلیں نہیں خریدیں۔اس لیے کہ ضرورت ہی نہیں پڑی۔مسجد میں رہتا اور وہیں اسباق کی تیاری کرتا تھا۔باہر نکلا ہی نہیں''۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی خودنوشت ''کاروانِ زندگی'' بھی سات حصوں پر مشتمل ہے۔ چوں کہ مولانا ایک عالمی شخصیت تھے، انہوں نے دنیا کے اکثر ممالک کا سفر کیا تھا، وہاں کی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی تھی اور وہاں کے اداروں سے بھی کسی نہ کسی درجے میں وابستہ تھے۔ان سب باتوں کا بھی اس میں تفصیلی ذکر ہے۔اس لیے ان کی خودنوشت موجودہ عہد کی خودنوشتوں میں ایک بلند مقام رکھتی ہے۔وہ جس طرح ان کے تلامذہ اور ارادت مندوں کے لیے مفید ہے، اسی طرح ان لوگوں کے لیے بھی قابلِ استفادہ ہے جو ان سے قلبی وروحانی وابستگی نہیں رکھتے ہیں۔

کاروانِ زندگی میں مولانا علی میاں نے اپنی ابتدائی تعلیم، ہندی وعربی اساتذہ، ندوۃ العلماء کی تاریخ، ملکی وغیر ملکی اسفار، ملک وبیرونِ ملک کی دینی جماعتوں اور تعلیمی اداروں سے اپنی اور ندوہ کی وابستگی کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ندوہ کے تذکرہ میں ماضی میں رونما ہونے والے ندوہ کے داخلی اختلافات کا بھی بڑی احتیاط سے ذکر کیا ہے۔مولانا کی اس خود نوشت کو بیسویں صدی عیسوی کی علمی ومذہبی تاریخ بھی کہا جاسکتا ہے،اور علماء رجال کا دلچسپ تذکرہ بھی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مذہبی آدمی بھی تھے اور اردو ادب سے بھی ان کا ٹانکا بڑھا ہوا تھا۔تاہم ان کی زندگی کا آخری حصہ مذہب ہی سے وابستہ رہا ہے۔اور ان کی خود نوشت ''آپ بیتی'' اسی آخری دور میں لکھی گئی ہے۔اس لیے ہم اسے مذہبی خودنوشت میں شامل کرتے ہیں۔ان کی خودنوشت سوانح اس وجہ سے تمام خودنوشتوں پر فائق ہے کہ اس میں خودنوشت نگار نے کوئی بات چھپائی نہیں ہے، کسی بات کو لکھنے میں اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا کہ میں مفسرِ قرآن اور عالمِ دین کی حیثیت سے معروف ہوں۔لوگ اسے پڑھ کر میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔مولانا دریابادی کی آپ بیتی میں ان کی زندگی کے حالات بھی ہیں اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقۂ ارادت منداں سے وابستگی کی داستان بھی اور ایامِ جوانی کے عشق ومحبت کی کہانی بھی۔مولانا کی ایک شادی ان کی اس معشوقہ سے ہوئی تھی جس کے لیے وہ جان دینے کو تیار تھے۔اور اگر اس سے ان کی شادی نہ ہوتی تو یا تو وہ خودکشی کر لیتے یا مجنوں کی طرح گلیوں کوچوں میں پھرتے۔مولانا نے اپنی اس شادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نکاح کے وقت قاضی کے سامنے مہر کی رقم کا مسئلہ آیا تو لڑکی کے باپ اور میرے والد کے درمیان اختلاف ہوگیا، میرے والد صاحب کو ایک لاکھ روپئے ہرگز منظور نہیں تھے۔میں والد صاحب کے اس اختلاف پر دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔کئی بار میرے جی میں آیا کہ قاضی سے صاف صاف کہہ دوں: ''نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز''۔

انعام الرحمٰن خاں کی خودنوشت ''زنداں کا داعی'' اپنے مشتملات کے اعتبار سے مذہبی نوعیت کی بھی ہے اور سیاسی وسماجی بھی۔مذہبی اس لحاظ سے کہ اس کے مصنف ایک مذہبی آدمی تھے، اور ایک مذہبی جماعت سے ان کا ذمہ دارانہ تعلق تھا۔اور سیاسی اس وجہ سے ہے کہ یہ ان خطوط پر مشتمل خودنوشت ہے جو انہوں نے مختلف اوقات میں جیل سے اپنی بیوی کو لکھے تھے۔ان خطوط میں سیاسی مسائل کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں اور دعوت وتربیت کے رہنما خطوط بھی۔یہی نوعیت ان کی اس ڈائری کی بھی ہے، جو انہوں نے ''نیسا کے شگوفے'' کے نام سے مرتب کی تھی۔جسے ۱۹۸۰ء میں سبحانیہ بک ڈپو جبل پور نے شائع کیا تھا۔

اردو میں سیاسی اور سماجی خودنوشت سوانح نگاری کی روایت ہمیں ۱۸۵۷ء کے بعد سے ملتی ہے۔سیاسی یا سماجی خودنوشتوں میں زیادہ تر خارجی واقعات وحادثات ہوتے ہیں،ان میں جذبات کی عکاسی نہیں ملتی،اگر ملتی ہے تو بہت کم۔مولوی محمد جعفر تھانیسری کی خونوشت سوانح '' تواریخ عجیب'' جس کا معروف نام ''کالا پانی'' ہے۔اس کی اہمیت

اس لیے بھی ہے کہ اس میں ایک طرف وہابی تحریک کی تعریف اوراس سے متعلق افراد کے کارناموں کا تذکرہ تو دوسری طرف انگریزوں کے ظلم واستبداد کی داستان بھی اس میں ملتی ہے۔

''داستانِ غدر'' مولوی ظہیرالدین دہلوی کی خودنوشت ہے۔اسے اردو کی اولین خودنوشتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔مولوی ظہیر الدین دہلی کے امراء وشرفاء میں شمار ہوتے تھے،اور بہادر شاہ ظفر کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی خود نوشت بہادر شاہ ظفر کے عہد کے دلی کے حالات کی آنکھوں دیکھی داستان ہے۔

اردو خودنوشتوں میں سر رضا علی کی خودنوشت ''اعمال نامہ'' کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔رضا علی انگریزی اور اردو دونوں ادب سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔''اعمال نامہ بیک وقت سیاسی وسماجی بھی ہے اور ادبی بھی۔اس میں رضا علی نے اپنے مادرِ علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بھی اپنی یادوں کے گہوارے کے طور پر اجاگر کیا ہے۔یہ سب سے پہلے ہندوستانی پبلشر دہلی سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی۔

حکیم احمد شجاع کی خودنوشت ''خوں بہا'' چودھری افضل حق کی ''میرا افسانہ'' نواب احمد سعید خاں چتاری کی ''یادِ ایام'' موضوع اور کیفیت کے اعتبار سے کافی حد تک ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔البتہ عبدالمجید سالک کی سر گزشت اپنا جداگانہ اور منفرد اندازِ تأثر رکھتی ہے۔چوں کہ اس کا اندازِ بیانیہ اور تاریخی ہے۔اس لیے یہ پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے اس میں اپنے خاندان اور اپنے عہد کے حالات اور کوائف کو رقم کیا ہے۔لیکن قاری کو سالک کے عہد کی سیاسی اور ادبی فضا کو دیکھنے اور سمجھنے میں قطعی دیر نہیں لگتی۔یہ ان کی خودنوشت سوانح نگاری کا بہت بڑا کمال ہے۔ادبی خودنوشتوں میں عبد الغفور نساخ ،سید اعجاز حسین، یوسف حسین خاں ،رشید احمد صدیقی ، احسان دانش اور جوش ملیح آبادی کی خودنوشتیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔لیکن ان میں خودنوشت کا وہ عیب موجود ہے کہ خودنوشت سونح نگار اپنی بہت سی باتیں چھپا کر کمیوں کو خوبی بنا کے اور بیشتر معاملات میں اپنی بات کو مبالغے کے ساتھ پیش کرتا ہے۔جیسا کہ میں نے شروع میں سید عبداللہ کے حوالہ سے عرض کیا۔اس سلسلے میں جوش ملیح آبادی کی خودنوشت سوانح ''یادوں کی بارات'' خاصی شہرت رکھتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جوش نے اپنے قلم کی پوری قوت اس کتاب میں صرف کردی ہے۔یہ ایک مشاق اور عظیم شاعر کی خودنوشت سوانح ہے۔جسے بہ ہر حال دل چسپ اور رنگا رنگ ہونا بھی چاہئے تھا۔جہاں تک ہماری محدود معلومات کا تعلق ہے دنیا کے کسی بڑے شاعر نے اس قدر شرح وبسط کے ساتھ اپنی زندگی کے حالات قلم بند نہیں کیے۔اور پھر لکھنے والے نے ڈھکی چھپی ہر بات کسی جھجھک ،تکلف، اندیشۂ ملامت اور خوف ورسوائی کے بغیر بیان کردی۔اس لیے ادبی ولسانی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ''یادوں کی بارات'' اپنی جگہ عریانیت اور برہنگی کا کوک شاستر بن گئی ہے۔بقول ماہر القادری: کوکا پنڈت زندہ ہوتا تو اس برہنہ نویسی کی داد جوش صاحب کو دیتا۔جوش نے جہاں اپنی خاندانی عمارت کا تذکرہ کیا ہے وہاں انداز کچھ ایسا اختیار کیا ہے گویا ان کے باپ دادا اودھ کے زمین دار نہیں بلکہ کسی اسٹیٹ کے فرمارواں اور والیٔ

ملک تھے۔ کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیے:۔

''میری حویلی کی اندرونی فضا: ہر طرف روشنی تھی، رنگینی تھی ،چہل پہل تھی، لونڈیاں ،باندیاں ،مغلانیاں،انائیں، دوائیں کھلائیاں،استانیاں، پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے والیاں،راتوں کو کہانیاں سنانے والیاں، چاروں طرف چلتی پھرتی تھیں''۔

(ص:۴۴)

''بیرونی فضا: رکاب داروں ، فراشوں ، سپاہیوں ،مولویوں، ماسٹروں، مصاحبوں، داستان گویوں، منشیوں، ضلع داروں اور کارندوں کا ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا۔کم و بیش ڈیڑھ سو اقربا و احباب اور ملازمین ہمارے یہاں روزے افطار کیا کرتے تھے۔ جوش نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہمارے یہاں کسی کا ناخون دکھتا تو گھر ڈاکٹروں سے بھر جاتا۔ یہ سوال بہ ہر حال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس زمانے میں چھوٹی بستی ملیح آباد میں ڈاکٹروں کی اتنی کثرت تھی؟

سید اعجاز حسین کی خودنوشت ''میری دنیا'' نہایت مہذب اور ہمدرد معلم کی تصویر پیش کرتی ہے۔ یوسف حسین خاں کی ''یادوں کی دنیا'' ایک مؤرخ اور ثقافتی نمائندہ کا تعارف کراتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کی خود نوشت ''آشفتہ بیانی میری'' کو ہم مستقل خودنوشت سوانح تو نہیں کہہ سکتے تاہم اس سے ان کی جودتِ طبع اور ندرتِ اسلوب کی بھرپور آئینہ داری ہوتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے ''آشفتہ بیانی میری'' میں اپنے حالات یا خاندانی پسِ منظر کا اشتہار نہیں پیش کیا بلکہ اسے اپنے مادرِ علمی علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی سے اپنی جذباتی وابستگی کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ان کی پوری آپ بیتی پر پوری مسلم یونیورسٹی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔جس میں ان کے بچپن یا خاندان کا رنگ بہت دھندلا بلکہ موہوم نظر آتا ہے۔

اردو خودنوشتوں کے تذکرے میں خواجہ حسن نظامی کی خودنوشت ''آپ بیتی'' کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔خواجہ صاحب کی یہ آپ بیتی ۱۹۱۹ میں منظرِ عام پر آئی۔ میرا خیال ہے کہ اس سے خودنوشت کے لیے آپ بیتی کی اصطلاح شروع ہوئی۔خواجہ صاحب نے بجا طور پر اپنی اس آپ بیتی میں اپنی ہستی کے عرفان کا بہی کھاتا قرار دیا ہے۔

اردو خودنوشت کی باقاعدہ ابتدا اگر چہ ۱۸۵۷ کے بعد سے ہوئی ہے لیکن اس صنف کو قبولیت بیسویں صدی کے اوائل میں حاصل ہوئی اور آزادی کے بعد اس کی رفتار میں خاصی سرعت آئی۔آئے دن شعراء، ادباء، ناقدین، سیاستداں اور خواتین اہلِ قلم کی خودنوشتی شائع ہوتی رہتی ہیں، جس میں وہ اپنے افکار ونظریات کو اپنے اپنے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تہذیبوں کو تحفظ اور روایتوں کی ترسیل کے لیے خودنوشت یا آپ بیتی کی صنف نہایت موزوں اور مناسب ہے۔اس لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ خودنوشتیں ہماری تہذیب وثقافت اور روایت واقدار کے تحفظ وفروغ کا بہترین ذریعہ ہیں اور اس صنف کو ارتقا کی منزل سے ہم کنار کرنا اپنی تہذیب وثقافت کو پروان چڑھانے اور آئندہ نسلوں تک اسے منتقل کرنے کے مرادف ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ملتِ اسلامیہ اور الطاف حسین حالؔی کی فکرمندی

(مسدس حالؔی کے آئینے میں)

محمد سراج الہدی ندوی ازہری

استاذ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد sirajazhari@gmail.com

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالؔی اپنے زمانے کے مسلم الثبوت شاعروں اور نثر نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۳۷ء مطابق ۱۲۵۳ھ میں پانی پت میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقے ہی میں حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی کا رخ کیا، وہیں مرزا غالبؔ سے بھی فنِ شاعری میں فیض اٹھانے کا موقع ملا۔ کچھ عرصے کے بعد دہلی سے پھر پانی پت آگیے اور ملازمت شروع کردی، کسبِ معاش کے لیے پھر وطن سے نکلے تو جہانگیر آباد کے رئیس نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ سے شناسائی ہوگئی اور تقریباً آٹھ سال تک ان ہی کے مصاحب رہے۔ شیفتہؔ علومِ اسلامیہ میں تبحر رکھنے کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو کے اچھے شاعر بھی تھے، ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے الطاف حسین حالؔی کا مذاقِ شاعری نکھرا، ذوقِ تنقید ابھرا اور ان کی دبی ہوئی علمی چنگاریاں بھڑک اٹھیں، پھر کیا تھا ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ شیفتہؔ کے انتقال کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں انہیں ایسی ملازمت مل گئی جس میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی عبارتوں کی تصحیح کا کام تھا، اس کی وجہ سے انہیں بہت ساری کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا، جس سے انگریزی ادب سے بھی اچھی واقفیت ہوگئی۔ اسی زمانے میں مولانا محمد حسین آزادؔ کے قائم کردہ ایسے مشاعروں میں بھی شرکت کی، جن میں مصرع طرح کے بجائے مختلف عنوانات پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں، حالؔی نے اس میں بھی نام کمایا اور وہ نظمیں بہت مشہور ہوئیں۔ حالؔی حافظِ قرآن تھے، انہوں نے مختلف علماء کرام سے تفسیر، حدیث، منطق اور فلسفہ وغیرہ کی بلند مرتبہ کتابیں بھی پڑھیں اور علم وادب کا گہرا مطالعہ بھی کیا، جس کا بھرپور اثر ان کی تحریروں میں موجود ہے، وہ ۱۹۱۴ء مطابق ۱۳۳۳ھ میں اس عالمِ رنگ وبو سے رحلت فرما گیے۔

الطاف حسین حالؔی اردو ادب کے نثر ونظم کے ایک اہم ستون ہیں، وہ اردو کے ایک ممتاز ناقد، بلند پایہ شاعر اور اہم سوانح نگار ہیں، تینوں حیثیتوں سے وہ ایک نمایاں مقام ومرتبے کے مالک ہیں، اردو زبان و ادب پر ان کے ڈھیر سارے احسانات ہیں، اس کے دونوں صنفوں میں ان کی تصنیفات و تالیفات موجود ہیں، نثر میں حیاتِ جاوید، حیاتِ سعدی، یادگارِ غالبؔ اور نظم میں مسدس حالؔی اور کلیاتِ حالؔی مع مقدمۂ شعر و شاعری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حالؔی مرحوم کی کتابوں میں ''مسدس'' کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، اشعار کی دنیا میں ایسی مقبولیت بہت کم

کتابوں کے حصے میں آئی ہے، اس کتاب نے شاعری میں صنفِ ''مسدس'' کی اچھی داغ بیل ڈالی، یہ کتاب اسکولوں اور مدرسوں میں داخل نصاب کی گئی، اس کے بہت سارے بند واعظوں اور خطیبوں نے یاد کیے، جن سے اپنے بیانات اور تقریروں کو زینت دی، بہت سارے بند بچوں اور بوڑھوں کو بھی ازبر ہوگیے، جو مصنف کے لیے بے پناہ خوشی کا باعث بنی، طبع دوم کے دیباچے میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

''پس مصنف کو اگر فخر ہے تو صرف اس بات پر ہے کہ اس نے زمینِ شور میں تخم ریزی نہیں کی اور پتھر میں جونک لگانی نہیں چاہی، اس نے ایک ایسی جماعت کو مخاطب گردانا ہے جو بے راہ ہے، پر گمراہ نہیں ہے، وہ رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں؛ مگر رستے کی تلاش میں چپ وراست نگراں ہیں، ان کے ہنر مفقود ہوگیے ہیں؛ مگر قابلیت موجود ہے، ان کی صورت بدل گئی ہے؛ مگر ہیولیٰ باقی ہے، ان کے قوی مضمحل ہوگیے؛ مگر زائل نہیں ہوئے، ان کے جوہر مٹ گیے ہیں؛ مگر جلا سے پھر نمودار ہوسکتے ہیں، ان کے عیبوں میں خوبیاں بھی ہیں؛ مگر چھپی ہوئی، ان کے خاکستر میں چنگاریاں بھی ہیں؛ مگر دبی ہوئی''۔

(دوسرا دیباچہ، متعلق بہ ضمیمہ ۱۳۰۳ھ، مسدس حالی، ص:۷)

یہ کتاب یعنی ''مسدس'' اصلاً سرسید احمد خان کی تحریک اور ترغیب دلانے پر لکھی گئی ہے، سرسید احمد خان نے حالی کی طبیعت کا رنگ دیکھ کر ان سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں کے زوال کے متعلق ایک نظم لکھ دو، مسدس حالی اسی کا ایک کامیاب نتیجہ ہے، جس کا اظہار کتاب کے پہلے دیباچہ میں بغیر نام لیے ہوئے بہت عمدہ انداز میں کیا گیا ہے، جو پڑھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ سرسید احمد خان بھی اس کتاب سے بہت خوش ہوئے اور یوں تبصرہ کیا:

''یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ اس کتاب نے ہماری صنفِ نظم میں ایک نیا دور پیدا کردیا، اس کی عبارت کی خوبی اور صفائی اور روانی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے، یہ امر کچھ تعجب خیز نہیں کہ اتنا مہتم بالشان مضمون اس قدر واقعیت کی پابندی کے ساتھ اور بلا اغراق و مبالغہ اور تمثیل و استعارہ کے جو کہ ہماری شاعری کی جان اور شاعروں کا ایمان ہے اور پھر اس قدر مؤثر اور سلیس اور فصیح طریقے سے بیان کیا جائے، اس کے بہت سے بند تو ایسے ہیں کہ ان کو پڑھ کر سخت سے سخت دل کے لوگ بھی بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتے، کیوں نہ ہو جو چیز دل سے نکلتی ہے وہ ضرور دل میں گھر کرتی ہے''۔

(تاریخ ادبِ اردو یعنی ہسٹر آف اردو لٹریچر، از: رام بابو سکسینہ، مترجم: مرزا محمد عسکری، ص:۴۱۲، طبع پنجم ۱۹۸۶ء)

''مسدس حالی'' نے اردو شاعری کے افق پر ایک نئی روح پھونکی ہے، اس سے اردو میں قومی و وطنی نظموں کی بنیاد پڑی اور مؤثر و پُر درد ہونے میں اپنی اہمیت منوائی، انداز بھی ہر طرح کے تکلف و تصنع سے پاک ہے، بہت سادہ اور صاف ستھری زبان استعمال کی گئی ہے، اس کتاب میں زمانۂ جاہلیت کی تصویر کشی، نبیِ رحمت (ﷺ) کی آمد، دعوت و تبلیغ کی کوششیں، اسلامی حکومتیں، اسلام کی عظمتِ رفتہ، مسلمانانِ سابق کے کارنامے، ان کے بلند خیالات اور اولوالعزمیاں اور موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی سستی و کاہلی اور پستی و زوال کا ذکر ہے، اندازِ بیان محبت بھرا اور سوز و درد میں ڈوبا ہوا ہے، کہیں جھنجھوڑا ہے تو کہیں غیرت دلائی ہے، اگر اس کتاب کو ''الہامی'' کہا جائے تو کوئی بے جا تبصرہ نہ ہوگا۔ یہ کتاب اصلاً ''مدوجزرِ اسلام'' ہے، جو ''مسدس حالی'' کے

نام سے مشہور ہے، ہمیں اس مضمون میں الطاف حسین حالؔی کی ان فکرمندیوں، دردمندیوں اور غم وافسوس کو بیان کرنا ہے، جن کا اظہار امتِ اسلامیہ کے تئیں انہوں نے کیا ہے، اور خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ وہ امت جسے خیر الامم کا لقب دیا گیا، ایک زمانے سے تقریباً تمام ہی میدانوں میں زوال کے دلدل میں پھنسی ہے اور پھنستی جارہی ہے، قدم نکالے نہیں نکل رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ ابھی اس کیفیت میں مزید امتداد ہے، امتِ اسلامیہ کے ان حالات پر حالؔی مرحوم کا دل کڑھتا تھا، وہ اسے صحیح ڈگر پر لانے کے لیے کوششیں کرتے رہے، ان کو جگایا، جھنجھوڑا اور صاف صاف کہا کہ اب بُرا وقت آیا ہی چاہتا ہے، جو کسی کو بھی نہ چھوڑے گا، ہوش میں آجاؤ، اپنے آپ کو سنبھال لو اور امت کی بھی فکر کرو، خوابِ غفلت سے بیدار ہوجاؤ، ہوش کے ناخن لو، یاد رکھو! اگر عذابِ الٰہی آ گیا تو سب پھنس جائیں گے، وہ یوں گویا ہیں:

کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والو
کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
برا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو
نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو
بچوگے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

(عنوان: غفلت، ص: ۷۸)

ایک دوسری جگہ بھی امتِ اسلامیہ کے ضمیر کو جھنجھوڑا، انہیں غیرت دلائی، سروں پر ذلت ونکبت کے بادل چھا جانے کی خبر دی اور اپنے ماضی کو یاد کرنے کو کہا، چاروں اطراف سے یہی صدا آرہی ہے کہ ان مسلمانوں کو کیا ہوگیا ہے، یہی تو وہ ہیں جن کی کل روشن تاریخ تھی، ترقی کی منزلیں طے کررہے تھے اور ہر جگہ بیداری کا ثبوت دے رہے تھے، اتنی جلدی یہ کیسے سوگیے، سنو، غافل مت ہوجاؤ، اپنے ماضی کو مت بھلاؤ، باخبر ہوجاؤ:

گھٹا سر پہ اِدبار کی چھارہی ہے
فلاکت سماں اپنا دکھلارہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے
چپ و راست سے یہ صدا آرہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہوگیے تم
ابھی جاگتے تھے، ابھی سوگیے تم

(عنوان: مسلمانوں...، ص: ۲۲)

آج اس امت کی سب سے بڑی بیماری مسلکی جھگڑے کا عام ہوجانا ہے، تعصب کو ہوا دینا ہے، لوگوں کو گروہ بندیوں اور نفرت کے بندھن سے باندھ دینا ہے، خدا کی پناہ، ایک فرقہ دوسرے فرقے کو کافر کہتا پھر رہا ہے، کوئی ایک دوسرے کو کھلے دل سے قبول کرنے کو تیار نہیں، کیا ہمارے دین نے ہمیں یہی سکھایا ہے، اگر صورتِ حال یہی رہی تو دنیا ہم پر ہنسنے کے علاوہ اور کیا کرسکتی ہے، ہائے مسلمان! تو کیا تھا اور کیا ہوگیا ہے، تمہاری ان حرکتوں سے مسلمانوں کی جگ ہنسائی ہوگی۔

نہ سنی میں اور جعفری میں ہو الفت
نہ نعمانی و شافعی میں ہو ملت
وہابی سے صوفی کی کم ہو نہ نفرت
مقلد کرے نامقلد پہ لعنت
رہے اہلِ قبلہ میں جنگ ایسی باہم
کہ دینِ خدا پر ہنسے سارا عالم

(عنوان: تعصب، ص: ۶۱)

اب محبت کے چراغ جلانے والے بہت کم رہے،

نفرت کی آگ کو ہوا دینے والے زیادہ ہیں، اللہ کے رسول (ﷺ) نے جنہیں علما سوء کہا تھا، اور وعیدیں سنائی تھیں، ان کی کثرت ہورہی ہے، علما تو مصلح ہوتے ہیں، جب وہی مفسد بن جائیں تو آخر اصلاح کی امید کس سے کی جائے گی؟ تحریر و تقریر سے نفرت کے بیج بونا اور ایک دوسرے کی تکفیر کرنا تو عام سی بات ہوگئی ہے، حالؔی ان حالات پر کڑھتے ہوئے کہتے ہیں:

بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی
جگر جس سے شق ہوں وہ تحریر کرنی
گنہ گار بندوں کی تحقیر کرنی
مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

(عنوان: علماءِ زماں، ص:۵۶)

اچھے علما کا بھی فقدان ہے، امت کا رجحان علومِ شریعت کی طرف بہت کم ہو چکا ہے، اور جو لوگ اس کام میں لگے ہوئے ہیں، ان کی اکثریت میں علمی گہرائی و گیرائی نہیں ہے، اگر ایسی ہی صورتِ حال رہی تو ذرا بتاؤ، کون ہے جو شریعت کی طرف رہنمائی کرے گا؟ کون ہے جو مسائل سمجھائے گا اور دعوت و تبلیغ کے کام کو سنبھالے گا؟ ذرا غور تو کرو!

وہ علمِ شریعت کے ماہر کدھر ہیں
وہ اخبارِ دیں کے مبصر کدھر ہیں
اصولی کدھر ہیں مناظر کدھر ہیں
محدث کہاں ہیں مفسر کہاں ہیں
وہ مجلس جو کل سر بسر تھی چراغاں
چراغ اب کہیں ٹمٹماتا نہیں واں

(عنوان: قحط علماءِ دین، ص:۶۱)

شعر و ادب کا معیار بھی اتنا گر چکا ہے کہ ادب کے نام سے سفاہت پھیلایا جارہا ہے، تعمیری ادب کی جگہ تخریبی ادب نے لے لی ہے، ایسا ادب جو ادب کے نام پر بدنما داغ ہے؛ لیکن آج کی مغربی دنیا ایسے ہی ادب کی ہمت افزائی کررہی ہے، اس ادب سے دین و ایمان تاراج ہورہا ہے، افسوس اس پر ہے کہ ایسا ادب لکھنے والے ہمارے مسلمان بھائی بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں، حالؔی نے ایسے ادب کے بارے میں یوں کہا:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بد تر
زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر
مَلَک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علمِ ادب ہے ہمارا

(عنوان: ہمارے شعرا، ص:۷۱)

توحید تو اسلام کی اساس ہے، وہ تو آبگینے سے بھی زیادہ نازک ہے، اس کے بغیر تو اللہ کے یہاں کوئی عمل قابلِ قبول نہیں؛ لیکن مسلمانوں نے اس میں بھی ملاوٹ کردی ہے، ہم غیروں کو تو غیروں کی پرستش کی بنیاد پر کھلے عام کافر کہتے ہیں؛ لیکن ذرا اپنا گریبان بھی تو کبھی جھانک لیں کہ ہمارے لیے ایک اللہ ہی کی پرستش ہے، یا ہم پر ہر طرح کی راہیں کھلی ہوئی ہیں، حالؔی نے یوں غیرت دلائی:

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر
جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہرِ سجدہ تو کافر
کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

(عنوان: شرک اور دعوی توحید،ص:۵۸)

آج کے مغربی طرزِ تعلیم مخلوط درس وتدریس اور اس ترقی یافتہ دور کی ٹکنالوجی نے تو بچوں کو بھی وقت سے پہلے ہی بالغ کردیا ہے، وہ نوعمری ہی میں عشق ومحبت کے جال میں ایسے گرفتار ہوجاتے ہیں کہ انہیں والدین کی فکر ہوتی ہے نہ گھر کے دیگر افراد کی اور نہ ہی اپنے دین وایمان کی، جب عنفوان شباب ہی میں یہ حالت ہوگئی، تو بعد میں کیا ہوگا، ہائے افسوس، بوڑھے والدین دکھ میں کراہتے رہتے ہیں، گھر میں فاقہ کی نوبت آجاتی ہے؛ لیکن یہ ناہنجار اولاد اپنی دلربا کی دلربائی کا اسیر رہتا ہے، حالؔی اس حالتِ زار پر آنسو بہاتے ہوئے یوں گویا ہیں:

اگر ماں ہے دکھیا تو ان کی بلا سے
اپاہج ہے باوا تو ان کی بلا سے
جو ہے گھر میں فاقہ تو ان کی بلا سے
جو مرتا ہے کنبا تو ان کی بلا سے
جنہوں نے لگائی ہو لو دلربا سے
غرض پھر انہیں کیا رہی ماسوا سے

(عنوان: دل برص:۷۵)

ایک جگہ امت کے تئیں اپنی دردمندی کا اظہار یوں کیا کہ ایک وقت تھا کہ ہر طرف ہمارا ہی چرچا تھا، چہار جانب ہمارے ہی جھنڈے فضاؤں میں لہرا رہے تھے، ہمیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا؛ لوگ سر آنکھوں پر بٹھایا کرتے تھے، ہم خیر الامم تھے؛ لیکن افسوس صد افسوس، ہمارے سارے نشانات مٹ چکے، اب ہماری پہچان صرف اتنی ہے کہ ہم اپنے آپ کو مسلمان گنتے ہیں، دوسرے مانیں یا نہ مانیں، ہماری اصلیت باقی ہو یا نہ ہو، وہ یوں گویا ہیں:

وہ ملت کہ گردوں پہ جس کا قدم تھا
ہر ایک کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا
وہ امت لقب جس کا خیر الامم تھا
نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں

(عنوان: مسلمانانِ ہندوستان،ص:۶۵)

''مسدس حالی'' کا آدھا سے زیادہ حصہ تو امتِ اسلامیہ کے حالاتِ زار ہی کے بیان میں ہے، جس میں حالؔی کی دردمندیاں وفکرمندیاں پوری طرح نمایاں ہیں، کسے لیا جائے اور کسے چھوڑا جائے، انہوں نے امت کے سینکڑوں عیوب گنائے، گراوٹوں کا تذکرہ کیا، عروج کی طرف آنے پر ابھارا، عظمتِ رفتہ کی بحالی کی دعوت دی اور اخیر کے متعدد بند میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعائیں کرتے ہوئے ''مسدس'' کو مکمل کیا، انہیں دعائیہ بند میں سے ایک بند پر میں اس مضمون کو سمیٹتا ہوں، جس میں محبت والفت، درد وسوز، اپنائیت اور اخلاص کی مکمل خوشبو پائی جاتی ہے، وہ یوں گویا ہیں:

انہیں کل کی فکر آج کرنی سکھادے
ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھادے
کمیں گاہِ بازیِ دوراں دکھادے
جو ہونا ہے کل آج ان کو سجھادے
چھتیں پاٹ لیں تاکہ باراں سے پہلے
سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

(عنوان: دعا،ص:۱۲۴)

☆☆☆☆☆☆

عصرِ حاضر کے تناظر میں
علامہ شبلی کا دعوتی اسلوب

محمد الیاس ندوی بھٹکلی
Email:nadviacademy@hotmail.com

علامہ شبلی نعمانیؒ کی علمی و دینی خدمات کے موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے کئی عجیب اتفاقات سامنے آتے ہیں ،مثلاوہ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور ۵۷ سال کی عمر میں انتقال کر گیے ،وہ ۱۸۵۷ء میں اس وقت دنیا میں آئے جب برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی نے ایک نیا رخ لیا۔ دوسری طرف علامہ شبلیؒ کی اس دنیا میں اسی سال آمد نے یہاں کی علمی وتحقیقی زندگی کو ایک نیا رخ دیا۔

ان کی علمی خدمات کے تین اہم اور ممتاز شعبے تھے جس میں وہ سب سے اونچی اور آخری سطح پر تھے اور وہ شعبے اردو ادب ،تاریخ نویسی اور سیرت نگاری کے تھے۔ عالمی سطح پر اردو ادب کے چار اساطین مولانا حالیؔ، ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزادؔ کے ادبی گروہ کے وہ سرخیل تھے۔ تاریخ نویسی کو انہوں نے ایک نیا رخ دیا اور علمی حلقوں میں اس کو اعتبار اور وزن سے ہمکنار کر دیا۔ اسی طرح سیرت نگاری کو انہوں نے مذہبی ضرورت سے زیادہ ایک علمی وتمدنی ضرورت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس کا ایک کامیاب نمونہ خود سیرت النبی (ﷺ) کی شکل میں عالمِ انسانیت کے سامنے رکھا ،اس میدان میں ان کو اردو ہی نہیں بلکہ تمام عالمی زبانوں میں انفرادیت حاصل ہوئی۔

عصرِ حاضر کے تناظر میں ان کے دعوتی اسلوب کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ اسلامی تاریخ کے پہلے مورخ تھے جنہوں نے خود جدید یورپی ومغربی اسلوب میں ان عیسائی مؤرخین اور مستشرقین کو منھ توڑ جواب دیا جنہوں نے ایک منصوبے کے تحت اسلامی تاریخ کو اس طرح مسخ کیا تھا کہ خود مسلم تعلیم یافتہ طبقوں اور نئی نسلوں کو اپنے مذہب وتاریخ سے متعلق احساسِ کمتری کا احساس ہونے لگا تھا۔ خود اپنے اسلاف سے ان کو نفرت پیدا ہو رہی تھی ،مغرب کے مقابلے میں خود اپنے اسلامی کارنامے ان کو پھیکے نظر آنے لگے تھے اور خود اپنی تاریخ سے اس کو گھن محسوس ہونے لگی تھی لیکن علامہ شبلیؒ کے اس میدان میں کامیاب علمی

اسلوب اختیار کرنے سے خود مسلمانوں کا سر فخر سے اونچا ہونے لگا اور ان میں اپنی سنہری تاریخ سے متعلق احساسِ تفاخر پیدا ہونے لگا، مثلاً جب یوروپین مؤرخ نے بہت زور سے اس بات کا پروپیگنڈہ کیا کہ حضرت عمرؓ نے اسکندریہ کے کتب خانوں کو جلا دیا تھا اور یہ مسلمانوں کی علم دشمنی کی دلیل تھی تو عالمی سطح پر علامہ شبلیؒ وہ پہلے مسلم مؤرخ تھے جنہوں نے پورے تاریخی دلائل کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا کہ مسلمانوں کے متعلق ان کا یہ الزام غلط ہے بلکہ صدیوں پہلے اس کتب خانے کو خود عیسائی برباد کر چکے تھے اور اس کے برخلاف مسلم سلاطین نے ہمیشہ ہر خطے میں اس طرح کے کتب خانوں کو خود بڑھ چڑھ کر قائم کیا۔ اسلامی حکومت میں جزیہ کو غیر مسلموں اور کافروں پر ظلم ثابت کرنے کے لیے یورپی مورخین نے انتھک کوشش کی لیکن علامہ شبلی وہ مؤرخ تھے جنہوں نے تاریخی حوالوں سے اس بات کو ظاہر کیا کہ یہ ان کے کفر کی وجہ سے اسلامی سلطنت میں لیا جانے والا ٹیکس نہیں تھا بلکہ اسلامی فوجوں کے ساتھ ان کے شریکِ جنگ نہ ہونے کا معاوضہ تھا، اس لیے کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں شریکِ جہاد ذمیوں کو ہمیشہ جزیہ سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا، اس طرح اس الزام کی تردید ہوئی کہ اسلام اپنی سلطنت میں کسی غیر مذہب والے کو برداشت نہیں کرتا۔

اسی طرح ان کا ایک اہم کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے عالمی سطح پر سیرت نگاری میں سب سے پہلے جرح وتعدیل اور اصولِ روایت کا پاس ولحاظ رکھا اور اس کو رطب ویابس اور غیر مستند روایتوں سے پاک کیا، ورنہ اس سے پہلے سیرت نگاری صرف واقعہ نگاری اور تاریخ نویسی تک محدود تھی اور میلادی جلسوں میں سیرت کی کتابوں کو تلاوت کی طرح صرف برکت کے لیے پڑھا جاتا تھا، اس طرز سے انہوں نے یہ ثابت کیا کہ ایمان واسلام صرف توحید کے قائل ہونے کا نام نہیں بلکہ وہ اقرارِ نبوت کے بغیر نامکمل ہے، اس لیے حاملِ وحی، سید الخلائق کی مکمل وصاف ستھری سیرت وسوانح بھی ایک انسانی ضرورت ہے نہ کہ صرف مذہبی۔

اپنے معاصر علماء میں ان کی سب سے بڑی امتیازی شان یہ تھی کہ انہوں نے تحریکِ ندوۃ العلماء میں حصہ لیکر علماء کی ایک ایسی جماعت تیار کی جو دعوتی میدان میں ہر طرح کے علمی ہتھیار سے لیس ہو کر مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کو مسکت جواب دے سکے اور اسلام کے تہذیبی وعلمی تفوق کو ثابت کرتے ہوئے خود ان کے معائب وعلمی خامیوں اور تمدنی تضاد بیانیوں کی نشاندہی کر سکے تاکہ اسلام کی تاریخی عظمت دنیا کے سامنے آسکے۔ برصغیر میں خود انہوں نے پہلی دفعہ یورپ کے مؤرخین ومستشرقین کا تنقیدی تعاقب کیا، ان کے حوالوں کا تجزیہ کیا اور ان کی غلطیاں گنائیں، وہ تاریخ نویسی میں اگرچہ جدت پسند تھے لیکن ان کا یہ کمال تھا کہ انہوں نے ماضی سے اپنے رشتے کو منقطع ہونے نہیں دیا، خود ان کا کہنا تھا کہ جب تک ہمارے علماء

جدید فلسفہ اور جدید علوم کو بذاتِ خود حاصل نہیں کرینگے ان کے لیے ناممکن ہے کہ وہ ان اعتراضات کا جواب دے سکیں جو یورپ کے ملحدین اسلام پر کرتے ہیں اور جن کا اثر ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے پر ہوتا ہے، بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ وہ پہلے مؤرخ تھے جنہوں نے قدیم علمِ کلام میں جدید علمِ کلام کے عناصر جمع کیے۔

اسی طرح ان کا ایک اہم کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے قدیم یونانی کتابوں کو براہِ راست آنکھ بند کرکے درس میں داخل نہیں کیا بلکہ ان علوم کو خود پہلے مسلمان بنایا اور پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دیا۔اسی طرح ندوۃ العلماء کے ذریعے انہوں نے برِصغیر کے دینی طبقے وعلماء میں موجود جمود کو ختم کیا ورنہ ہمارے علماء بالعموم درسیات یا پھر تصنیفی میدان میں فقہ وتصوف اور اختلافی مسائل پر تحقیق تک محدود تھے ،پہلی دفعہ انہوں نے ان کے تصنیفی دائرے کو مسلمانوں کی لسانی ،تہذیبی وتمدنی ،تاریخی وعلمی اور سماجی وسیاسی میدانوں تک وسیع کردیا،ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین سے شائع کتابیں اس کی شاہد ہیں،عجمی ممالک میں مناظرہ کو سب سے پہلے انہوں نے ہی ایک نیا رخ دیا،دوسرے الفاظ میں اس کی بگڑی شکل کو بدل دیا اور حق کو ثابت کرنے کے لیے جلسوں کے انعقاد اور اس میں طول وطویل لاحاصل مناظروں کے بجائے ایک دل نشیں شکل دی ،انھوں نے اس طرح کے الزام کا جواب دینے کے بجائے اپنے دعووں کو ایسے تحقیقی اور موثر انداز میں پیش کیا کہ سامنے والا خاموش ہوگیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا ،الفاروق کے ذریعے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دفاع کیا اور شیعوں کو خاموش کیا ،سیرت النعمان کے ذریعے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا علمی تفوق ثابت کیا اور اہلِ حدیث علماء کی غلط فہمیاں دور کیں۔اسی طرح علمِ کلام کے ذریعے عیسائی مورخین اور مستشرقین کا منھ توڑ علمی جواب دیا۔

غرض یہ کہ علامہ شبلیؒ نے اپنی مختصر ۵۷ سالہ زندگی میں اسلام کی علمی وتحقیقی خدمت کے ذریعے سے یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی کہ مثبت علمی وتحقیقی اسلوب کے ذریعے اسلام کے تفوق وبرتری کو ثابت کرنے کی کوشش نہ صرف دیرپا ومستحکم ہوتی ہے بلکہ اسلام دشمن طاقتوں کا اس سے بہتر انداز میں جواب ہی نہیں دیا جاسکتا۔

اس طرح اللہ تعالی نے علامہ شبلیؒ کی شکل میں ملتِ اسلامیہ کو وہ عظیم تحفہ دیا تھا جس پر مسلمانانِ برِصغیر صدیوں تک فخر کرتے ہوئے اپنا سر اونچا کرسکیں گے اور عالم اسلام کا کوئی دوسرا خطہ بڑی مشکل سے اس کی نظیر پیش کرسکے گا۔

ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء ،والله ذوالفضل العظيم ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

مفکر اسلامؒ اور ہندوستانی مسلمان، قربانی اور خدمات

''ہندوستانی مسلمان: ایک تاریخی جائزہ'' کی روشنی میں

محمد خالد ندوی غازیپوری

استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت جامعیت کی شان رکھتی تھی، فیاضِ ازل نے ان کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، ان کی خدمات کا دائرہ صرف تعلیمی و دعوتی میدانوں میں محدود نہیں ہے، بلکہ تاریخی اور ثقافتی میدانوں میں گہرے نقوش ثبت کر چکے ہیں، تاریخ کسی قوم کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہے، اگر تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے تو اس کے غیر معمولی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور نسلیں فکری اعتبار سے مردہ ہو جاتی ہیں۔ اس حقیقت کا احساس حضرت مولاناؒ کے خاندانی بزرگوں اور اسلاف کو شدت سے تھا، اسی لیے انہوں نے موضوع کو اہمیت دی، اور اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دئے، چاہے وہ حضرت کے دادا مرحوم سید فخر الدین خیالی ہوں یا آپ کے والدِ گرامی قدر علامہ عبدالحی حسنیؒ، اس موضوع پر دونوں کی گرانقدر خدمات کا زمانہ شاہد ہے۔

اسی موروثی جذبے اور صلاحیت سے انھوں نے ملکِ ہندوستان جو اُن کا وطن ہے، پر مسلمانوں کے اثرات، ان کی خدمات، اور کارناموں پر ایک جامع اور مختصر کتاب تحریر فرمائی ہے، جو ''ہندوستانی مسلمان: ایک تاریخی جائزہ'' کے نام سے معروف ہے، یوں تو ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب پر بے شمار کتابیں مختلف زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں، پروفیسر مجیب کی انگریزی میں ''اینڈین مسلمس'' پروفیسر عابد حسین کی اردو میں ''ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں'' مصر کے وزیرِ اوقاف عبدالمنعم النمر کی عربی میں ''تاریخ الاسلام والمسلمین فی الھند'' معروف کتابیں ہیں، ان کے علاوہ بھی بلند پایہ متعدد کتابیں ہیں، جن کا اپنا علمی اور فکری مقام ہے، اور معروف اہلِ قلم کی لکھی ہوئی ہیں، حضرت مولانا علی میاں نور اللہ مرقدہ کی زیرِ تذکرہ کتاب ''ہندوستانی مسلمان: ایک تاریخی جائزہ'' ان تمام کتابوں سے الگ ہے، اور اس میں مسلمانوں کی اپنی تہذیبی خصوصیات، ان کے مسائل اور مشکلات، ان کی علمی خدمات اور ان کے اداروں کا تعارف موجود ہے۔

کتاب کی اشاعت کا محرک

ساتھ ہی ساتھ اس کا مقصد برادرانِ وطن کو مسلمانوں کے طرزِ زندگی، ثقافت، رہن سہن، عبادت اور دیگر ضروری تہذیبی قدروں سے روشناس کرانا ہے، اور ان کے

ذہن میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہے، کیونکہ یہ بات صرف نا واقفیت تک محدود نہیں ہے، بلکہ زیادہ خطرناک اور تشویش انگیز بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک پوری کی پوری قوم کی تہذیب و تاریخ، اس کے گذشتہ کارناموں اور ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں اس نے جو مرکزی اور اہم پارٹ ادا کیا ہے اور اس راہ میں جو بیش بہا قربانیاں دی ہیں ،اُن کو نظر انداز کرنے اور اُن کے انکار کرنے کا رجحان پیدا ہو چلا ہے، ہندوستان کی تاریخ کو اس طرح پیش کرنے کی ایک منظّم کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کا دور گویا ایک پردیسی قوم کا سامراجی دور تھا، جو ہر طرح کی خوبی اور حسن سے خالی تھا ،اُس دور میں کوئی بلند شخصیت ،کوئی تمدن اور علمی کارنامہ، ملک کی تعمیر و ترقی کا کوئی بے لوث اور بے داغ کام نہیں ہوا، جس پر ہندوستان کو فخر کرنے کا موقع ہو، آزادی کی طویل جنگ میں اُس کی حیثیت محض تماشائی اور غیر متعلق فریق کی تھی اور اگر اس نے کہیں اتفاقاً حصہ لیا تو اس کی کوئی قابلِ ذکر حیثیت نہیں، اِس طرح ہم ہندوستان کے ہرے بھرے اور سدا بہار درخت کی ایک ثمر دار شاخ پر تیشہ چلا رہے ہیں اور یہ ثابت کر رہے ہیں کہ آٹھ سو، ہزار برس تک یہ درخت بے فیض اور بے ثمر رہا، اور اِس ملک میں خزاں کا دور دورہ رہا، یہ واقعہ تاریخی حقائق کے بھی خلاف ہے اور اس سے ہمارے ملک کی زرخیزی اور مردم خیزی اور اس کی فطری صلاحیت پر بھی حرف آتا ہے، اس طرح ہم نہ صرف یہ کہ کروڑوں کی تعداد میں بسنے والی ایک قوم کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں اور اس کی دل آزاری کرتے ہیں اور اس کی امنگوں پر اوس ڈالتے ہیں، بلکہ اس ملک، اس کی تاریخ اور اپنی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے ساتھ بھی ناانصافی کرتے ہیں ،جن کو اس کی بڑی ضرورت ہے کہ اس دور کی ممتاز اور قابلِ قدر شخصیتوں کا نمونہ ان کے سامنے لایا جائے ،اِسی ضرورت و حقیقت کا احساس اس کتاب کی اشاعت کا محرک ہے۔

ملک کے عظیم معمار

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان نہ صرف ملک کے آزاد باعزت شہری اور قدیم باشندے ہیں، بلکہ اس عظیم ملک کے معمار ہیں، انہوں نے اس ملک کی خدمت کی، اس کا پایہ بلند کیا، اس کے تمدن اور ذہن کو نئی زندگی اور وسعت عطا کی، اس کو نئی دینی اور اخلاقی قدروں سے روشناس کیا، اس کے چمن کو نئے سلیقے سے سنوارا، ان کا پایہ سب سے بلند ہے، یہاں کی خاک کے ذرے ذرے پر ان کی عظمت کا نقش اور اس ملک کے چپے چپے پر ان کی ذہانت اور ان کے خلوص اور ان کے ذوقِ تعمیر اور جذبۂ خدمت کی یادگاریں ہیں، یہاں زندگی اور تہذیب کا ہر گوشہ ان کے ذوقِ لطیف اور مذاقِ سلیم کی شہادت دیتا ہے، ہندوستان کی سرزمین پر جو شخص بھی قدم رکھے گا اور یہاں کی تاریخ کی جو بھی ورق گردانی کرے گا، وہ بے اختیار پکار اٹھے گا:

ابھی اس راہ سے گذرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

مسائل ومشکلات کا تذکرہ

حضرت مولانا نے مسلمانوں کی مشکلات اور ان کی شکایات کا عنوان بھی قائم کیا ہے، اور ان کو تفصیل سے بیان کیا ہے، لیکن اس طرح کہ وطن اور برادرانِ وطن سے کہیں نفرت کا اظہار نہیں ہوتا ہے، ملکوں کی تاریخ میں اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں لہذا ایسے موقع پر باہمی اتحاد و اعتماد کی فضا پیدا

کرنے کی کوشش کرنی چاہئے ، اور فرقہ وارانہ مسئلے کو عقل مندی و ہوشمندی کے ساتھ حل کرنا چاہیے، حضرت مولاناؒ نے اس کتاب کے ذریعہ ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کا وقار بلند کیا ہے، انہوں نے صرف گفتار اور اشہبِ خامہ کی رفتار سے ہندوستان کا تعارف نہیں پیش کیا، بلکہ اپنے کردار اور طبعِ خوددار کے ذریعہ پورے ہندوستان کا سر بلند کیا ہے، مولانا کی شخصیت چمن کے ان خوددار کانٹوں کی طرح تھی ، جو شبنم کے لیے دامن کو پھیلایا نہیں کرتے ، سونے کے ڈلے ان کے لیے خزف ریزوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے، مولانا کے قلم سے ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں کتاب اس قائد کی کتاب معلوم ہوتی ہے، جسے اپنی قوم کی کمزوریاں تو معلوم ہیں، لیکن اس کی خوبیاں بھی معلوم ہیں، ان خوبیوں کو اس لیے اجاگر کرنا ہے کہ قوم کو اپنی صلاحیتوں کے بارے میں اعتماد پیدا ہو، اور کمزوریوں کا تذکرہ اگر کرنا ہے تو اس انداز سے کرنا ہے کہ اپنی اصلاح کا جذبہ پیدا ہو، وہ نہ تو مایوس ہو جائے اور نہ شکستہ خاطر ہو، کتاب میں مسلمانوں کا تذکرہ زیادہ ملے گا، کیونکہ کتاب بیرونِ ممالک میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعارف کے طور پر لکھی گئی ہے ، اور بہت جامع اور باوقار تعارف ہے ، ایک مسلمان مصلح، قائد کے شایانِ شان ہے ، یہ واحد کتاب ہے ،جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی تہذیب پر مسلمانوں کے کیا احسانات ہیں ، عربی اور اسلامی علوم کی یہاں مسلمانوں نے کیسی خدمات انجام دی ہیں اور عقیدۂ توحید کی خوشبو سے مشامِ جاں کو معطر کیا۔

توحید اور خدا پرستی کا عطیہ

سب سے بیش قیمتی اور نادر تحفہ جو مسلمان یہاں لائے ، وہ اسلام کا خالص اور بے میل عقیدۂ توحید تھا، جس کے تحت عبد و معبود کے درمیان دعا و عبادت کے لیے کسی درمیانی ہستی کی ضرورت نہیں ، اس عقیدۂ توحید میں تعددِ الٰہ خدا کے نظریہ یا سایہ کے تصور اور حلول و اتحاد کے عقیدہ و نظریہ کی گنجائش نہیں ، بلکہ خدائے واحد و بے نیاز کی الوہیت اور وحدانیت کا اعتراف و اقرار ہے، جس کا نہ کوئی بیٹا ہے نہ باپ اور نہ خدائی میں کوئی اس کا شریک ، کائنات کی خلقت و پیدائش ، دنیا کا نظم و نسق اور زمین و آسمان کا اقتدارِ اعلی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

ہندو تہذیب اور ہندو مذہب پر اسلام کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے مشہور فاضل و مورخ ڈاکٹر کے ایم پانیکر لکھتے ہیں:

> ''یہ بات تو واضح ہے کہ اس عہد میں ہندو مذہب پر اسلام کا گہرا اثر پڑا ، ہندوؤں میں خدا پرستی کا تصور اسلام ہی کی بدولت پیدا ہوا، اور اس زمانے کے تمام ہندو پیشواؤں نے اپنے دیوتاؤں کا نام چاہے کچھ بھی رکھا ہو، خدا پرستی ہی کی تعلیم دی، خدا ایک ہے ، وہی عبادت کے لائق ہے ، اور اسی ہی کے ذریعے ہمیں نجات مل سکتی ہے۔'' (بحوالہ ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک: ص ۳۵۰)

اسلامی اخوت و مساوات کا تحفہ

اجتماعی زندگی میں ہندوستان کے لیے سب سے نئی اور قیمتی چیز اسلامی اخوت و مساوات کا تصور تھا، مسلمانوں کے یہاں نہ تو طبقاتی اونچ نیچ تھی اور نہ اچھوت نام کی کوئی قوم تھی، ان کا عقیدہ تھا کہ کوئی شخص جنم کا ناپاک اور جاہل نہیں ہوتا کہ

جس کو حصولِ علم کا حق نہ ہو، کسی پیشے یا صنعت کے لیے کوئی ذات خاص نہ تھی ، بلکہ ایک ساتھ رہتے تھے، کھاتے پیتے تھے اور امیر وغریب سب پہلو بہ پہلو حصولِ علم کی کوشش کرتے تھے ، ہر شخص کو حق تھا کہ جو پیشہ چاہے اختیار کرے ، اس موقع پر حضرت مولاناؒ نے پنڈت جواہر لال نہرو کا اقتباس نقل کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے ، پنڈت جواہر لال نہرو نے اس تاریخی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''شمال مغرب سے آنے والے حملہ آوروں اور اسلام کی آمد ہندوستان میں کافی اہمیت رکھتی ہے، اس نے ان خرابیوں کو جو ہندو سماج میں پیدا ہوگئی تھیں، ذاتوں کی تفریق ،چھوت چھات اور انتہا درجہ کی خلوت پسندی کو بالکل آشکارا کر دیا ،اسلام کے اخوت کے نظریے اور مسلمانوں کی عملی مساوات نے ہندوؤں کے ذہن پر بہت گہرا اثر ڈالا ،خصوصا وہ لوگ جو ہندو سماج میں برابری کے حقوق سے محروم تھے، اس سے بہت متاثر ہوئے''

(بحوالہ تلاش ہند ص ۵۲۵، ۵۲۶)

(ترجمہ Discovery of india)

عورت کے حقوق اور بعض رسوم کی اصلاح

تیسرا تحفہ جو مسلمان اس ملک کے لیے لائے وہ عورت کی عزت اور خاندانِ انسانی کے ایک باعزت فرد اور مرد کی رفیقۂ حیات کی حیثیت سے اس کا تعارف تھا، ایک ایسے ملک میں جہاں شریف عورتیں شوہروں کی موت پر ''ستی'' ہوجاتیں تھیں، کیونکہ سماج اور خود ان کی نظر میں شوہر کے بعد انہیں زندہ رہنے کا حق ہی نہیں تھا، اسلام کے بخشے ہوئے صنفِ نازک کے حقوق کی جو اہمیت ہوسکتی تھی وہ محتاج بیان نہیں، ستی کی مہیب اور لرزہ خیز رسم کی اصلاح میں بھی مسلمان سلاطین اور اہلِ حکومت نے ممکن حصہ لیا ۔(ہندوستان کے مذہبی عقائد اور رسوم کے احترام کی رعایت کے ساتھ) پہلے کی نسبت مشہور سیاح ڈاکٹر برنیر لکھتا ہے:

''آج کل ''ستی'' کی تعداد کم ہوگئی ہے، کیونکہ مسلمان جو اس ملک کے فرمانروا ہیں، اس وحشیانہ رسم کو نیست و نابود کرنے میں حتی المقدور کوشش کرتے ہیں، اگر چہ اس کے امتناع کے واسطے کوئی قانون مقرر نہیں ہے ، کیونکہ ان کی پالیسی ''(تدبیرِ مملکت) کا وہ جزء ہے کہ ہندوؤں کے معاملے میں دست درازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے ، بلکہ قومی رسوم کو ادا کرنے میں ان کو آزادی دیتے ہیں ، تاہم ستی کی رسم ورواج کو دوسرے انداز سے روکتے رہتے ہیں ، یہاں تک کہ کوئی عورت بغیر اجازت اپنے صوبہ کے حاکم کے ستی نہیں ہوسکتی اور صوبہ دار ہرگز اجازت نہیں دیتا، جب تک واقعی طور پر اس امر کا یقین نہ ہوجاتا کہ وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آئے گی ،صوبہ دار بیوہ کو بحث و مباحثہ سے سمجھاتا ہے اور بہت سے وعدے کرتا ہے، اگر اس کی فہمائش اور تدبیر کارگر نہیں ہوتیں تو کبھی ایسا کرتا ہے کہ محل سرا اُس کو بھیج دیتا ہے، تاکہ بیگمات بھی اس کو اپنے طور پر سمجھائیں ،مگر باوجود ان سب امور کے ستی کی رسم اب بھی قائم ہے، خصوصا ان راجاؤں کے علاقوں اور عمل داریوں میں جہاں کوئی مسلمان صوبہ دار نہیں ہے''۔(بحوالہ وقائع سیرت وسیاحت

Tranel in mughal empire از: ڈاکٹر برنیر ترجمہ جلد دوم ص ۱۷۲)

فن تاریخ

مسلمانوں نے بہت سے جدید علوم بھی ہندوستان میں منتقل کیے، ان علوم میں تاریخ کا فن بہت اہم ہے، کیونکہ اس وقت تک اس فن میں یہ ملک بہت تہی دست تھا، یہاں کوئی کتاب تاریخ کی کتاب کہلانے کی مستحق نہیں تھی، بلکہ صرف مذہبی نوشتے، رزمیہ قصائد اور مہابھارت و رامائن کے نسخے ملتے تھے، مسلمانوں نے فن تاریخ میں مستقل کتب خانہ تیار کر دیا، جس کا شمار تاریخ کے وسیع کتب خانوں میں کیا جاسکتا ہے، جو کسی ملک میں وجود میں آئے۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان اپنی کتاب ''تمدن ہند'' میں لکھتا ہے:

''قدیم ہند کی کوئی تاریخ نہیں ہے، ان کی کتابوں میں مطلقاً تاریخی واقعات درج نہیں ہیں''۔

پھر یہ لکھنے کے بعد کہ ویدا اور مہابھارت سے کسی قدر اس ملک کے حالات پر روشنی پڑتی ہے کہتا ہے:

''ہندوستان کا تاریخی زمانہ فی الواقع مسلمانوں کی فوج کشی کے بعد سے شروع ہوا اور ہندوستان کا پہلا مؤرخ مسلمان ہیں۔'' (بحوالہ ''تمدن ہند کتاب سوم ہندوستان کی تاریخ ص ۱۴۶)''۔

نئے اسالیب

ہندوستان کو مسلمانوں سے عمومی طور پر وسعتِ خیالی، ندرتِ فکر اور شعر و ادب کے نئے اسالیب ملے، نیا زاویۂ نگاہ، نیا اندازِ فکر بغیر عقلی اور ادبی فکری امتزاج کے ناممکن تھا، دوسرے تحائف اور اضافوں کے ساتھ جو مسلمانوں نے ہندوستانی تہذیب میں کیے، مسلمانوں نے اس ملک کو ایک نہایت حسین اور وسیع زبان دی، جو ہندوستان کی مختلف قوموں کے درمیان تبادلۂ خیال کا ذریعہ اور علم و ادب کی زبان قرار پائی، اس سے مراد اردو ہے جس کی وسعت اور شیرینی محتاجِ تعارف نہیں، قدیم ہندوستان کی تصویر بابر کے قلم سے: بابر اپنی ''توزک'' میں لکھتا ہے:

''ہندوستان میں اچھے گھوڑے نہیں، اچھا گوشت نہیں، انگور، پپیتا نہیں، برف نہیں، آبِ سرد نہیں، مدرسہ نہیں، مشعل نہیں، شمع دان نہیں، شمع کے بجائے ڈیوٹ ہوتا ہے، باغوں اور عمارتوں میں آبِ رواں نہیں، عمارتوں میں نہ صفائی ہے، نہ موزونی، نہ تناسب، عام آدمی ننگے پاؤں ایک لنگوٹی لگائے پھرتے ہیں، عورتیں دھوتی باندھتی ہیں، جس کا آدھا حصہ کمر سے لپیٹ لیتی ہیں اور آدھا سر پر ڈال لیتی ہیں''۔

میوہ جات کی ترقی

سرسبزی و شادابی کے باوجود اس ملک میں میوہ جات اور پھل بہت کم تعداد میں اور کم حیثیت ہوتے ہیں، اور جو کچھ پیدا ہوتے تو وہ عموماً خودرو ہیں، جن کی طرف اہلِ ملک خاطر خواہ توجہ نہیں دیتے تھے، لیکن جب مغل اس ملک میں داخل ہوئے تو انہوں نے پھلوں اور میوہ جات کو بڑی ترقی دی۔

صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کی ترقی

سلطان محمد بن شاہ گجراتی نے متعدد کارخانے قائم کیے تھے، جن میں کپڑا بنائی، رنگائی، چھپائی اور ڈیزائن تیار کرنے کا کام ہوتا تھا، سنگ تراشی، ہاتھی دانت، ریشمی کپڑے

اور کاغذ سازی کے کارخانے بھی قائم کیے گیے ، نیز سلطان کے عظیم کارناموں میں ملک کی ترقی ، مدرسوں ،مسجدوں، مسافر خانوں کی تعمیر، زرعی پیداوار میں اضافہ ، پھلدار درختوں اور باغات کی تعمیر شامل ہے، اس حقیت کا اعتراف سابق صدرِ کانگریس اور جنگِ آزادی کے ایک رہنما ڈاکٹر پٹابی سیتا رمیہ نے کانگریس کے اجلاس جے پور میں اپنے خطبۂ صدارت میں ان الفاظ میں کیا ہے:

'' مسلمانوں نے ہمارے کلچر کو مالا مال کیا ہے ، ہمارے نظم ونسق کو مستحکم اور مضبوط بنایا، نیز وہ ملک کے افراد کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کامیاب ہوئے ،اس ملک کے ادب واجتماعی زندگی میں ان کی چھاپ بہت گہری دکھائی دیتی ہے''۔

(بحوالہ خطبہ صدارت انڈین نیشنل کانگریس اجلاس جے پور ۱۹۴۸)۔

اسی طرح ہندوستان میں مسلمانوں کے طبی ،تعمیری اور تصنیفی ناقابلِ فراموش کارنامے ہیں ، نیز علمائے کرام صوفیائے عظام کی تعلیم وتربیت اور صحبت کے اثر سے پورے کے پورے معاشرے کی کایا پلٹ گئی ،اس کا رخ شر سے خیر کی طرف ہوگیا ،لوگوں کے عادات واطوار بدل گیے ،مزاج بدل گیا، نگاہ کا زاویہ بدل گیا۔

اس کتاب میں حضرت مولانا نے مسلمانوں کی مشکلات کا تذکرہ کیا ہے اور ان کو عارضی بتایا ہے : وہ تحریر فرماتے ہیں:

'' ہندوستانی مسلمان آج کل ایک آزمائش کے دور سے گذر رہے ہیں ،اوران کو اپنی قومی زندگی میں چند دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ، ان مشکلات میں بعض خود ان کی غلطیوں کا نتیجہ ہیں، اور بعض ماضی کا ورثہ اور پچھلی تاریخ کا'' بقایا'' ہیں ، کچھ دشواریاں ایسی ہیں ، جو ان حوادث وواقعات کی پیدا کردہ ہیں ، جو چند برسوں قبل ہندوستان میں پیش آئے ،لیکن اس میں شک نہیں کہ راہ کی یہ دشواریاں عارضی ہیں اور رہمارے دیکھتے دیکھتے ابتلاء کا یہ موسم گذرنے جانے والا ہے، بشرطیکہ مسلمان صبر وضبط سے کام لیں اور مسائل کو ٹھنڈے دماغ سے حل کرنے کی کوشش کریں''۔

اختتامیہ

اس کتاب کے مذکورہ بالا مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ہر ہندوستانی کی ایک بنیادی ضرورت ہے، بلکہ ان حقائق کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ مسلمانانِ ہند جو آج کل تاریخ کے نازک ترین دور سے گذر رہے ہیں ، زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ،اوراس کے لیے سرگرمِ عمل بھی ہیں ،اس ملک کی حدتک ان کی شخصیت لازوال اور زندۂ جاوید ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

☆☆☆

دینی مدارس اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی فکرمندی

عبدالباسط ندوی

المعہد العالی امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

اللہ تبارک وتعالی نے اپنی مخلوقات میں تمام جانداروں اور حیوانوں کو متحرک وفعال بنایا اور انہیں اختیار دیا کہ اپنے اختیار وضرورت کے تحت دفاع واقدام کریں، اپنی پسند وخواہشات کی تکمیل کے لیے تگ ودو اور دوڑ بھاگ کرتے رہیں، اور اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے خود کفیل ہوں۔ چنانچہ ہم مختلف انواع کے جانوروں، درندوں سے لے کر چرندو پرند اور حشرات الارض تک کو دیکھتے ہیں کہ وہ خود اپنی کفالت کرنے میں کسی کے محتاج نہیں ہیں، اپنی ساری ضرورتوں کی تکمیل وہ خود کر لیتے ہیں، اللہ تعالی نے انہیں بھی حواسِ خمسہ اور اس کا شعور عطا فرمایا، جس کے ذریعہ وہ اپنا نفع ونقصان پہچان لیتے ہیں، اور اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں، جبکہ اللہ تعالی نے انسانوں کو اشرف المخلوقات قرار دیتے ہوئے حواسِ خمسہ کے علاوہ عقل سے بھی نوازا اور یہی دوسرے حیوانوں سے انسانوں کو ممتاز کرتی ہے کہ وہ عقل کے ذریعہ ان تمام حیوانوں اور جانداروں، جمادات ونباتات اور اللہ کی دیگر مخلوقات کو اپنے قابو میں کر کے اس سے اپنی مرضی وچاہت کے مطابق کام لے لیتے ہیں، یہ اس لیے بھی ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دینے کے ساتھ پوری دنیا اور اس کی جملہ اشیا کو انسانوں ہی کے لیے پیدا فرمایا: ﴿**ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا**﴾ (البقرہ:۲۹) (اور وہی (اللہ) ہے، جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے۔) کہیں فرمایا: ﴿**ألم تروا أن اللہ سخر لکم مافی السموات وما فی الارض وأسبغ علیکم نعمہ ظاھرۃ وباطنۃ**﴾ (لقمان:۲۰) (کیا تم لوگوں کی اس پر نظر نہیں کہ اللہ نے تمہارے ہی کام میں لگا رکھا ہے اس (سب) کو جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور اس نے تم پر اپنی حسی اور معنوی نعمتیں پوری کر رکھی ہیں۔)

چنانچہ آج انسان پوری کائنات میں پھیلی ہوئی اشیا کو اپنی کوشش ومحنت سے اپنے تصرف میں لا رہا ہے، اس سلسلے میں اللہ کا نظام ہے کہ جو جتنی محنت وکوشش کرے گا اسی لحاظ سے اس کو کامیابی ملے گی۔ "**و أن لیس للإنسان إلا ما سعی**" (النجم:۳۹) (اور انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔) اور "**من جد وجد**" جس نے محنت وکوشش کی بامراد ہوا۔ اللہ تعالی نے اس سلسلے میں مؤمن وکافر کے درمیان کوئی

فرق نہیں رکھا، چنانچہ ٹکنالوجی کے اس دور میں انسان اپنی کوشش ومحنت کے ذریعہ نئے نئے انکشافات کررہا ہے، نئی نئی چیزوں کو ایجاد کررہا ہے اور اس راہ میں جو انسان جتنی محنت کرے گا، اسی اعتبار سے اسے ترقی ملے گی، چنانچہ اس دنیا میں ہر انسان اپنی محنت وتگ ودو کے اعتبار سے دنیوی ترقی کے منازل طے کرتا جارہا ہے۔ ان انسانوں میں اللہ تعالی نے اپنے اوپر ایمان لانے والوں اور اپنے رسول ﷺ کی اتباع کرنے والوں کو خاص امتیاز بخشا اور اپنی وحی کے ذریعہ خود انہیں ان کا وہ مقام بتایا جہاں تک وہ اپنے حواس اور عقل کے ذریعہ رسائی حاصل نہیں کرسکتے تھے، تاکہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنے اختیار وپسند کے ساتھ اپنے رب کی مرضی وچاہت کو جان سکیں اور صرف عقل ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ وحی کی بنیاد پر اس دنیا کے نظام کو صحیح ڈگر پر چلا سکیں اور اس کائنات کے بنانے والے کی پسند وناپسند کو اپنی ناقص پسند وناپسند پر ترجیح دے کر دنیا وآخرت میں کامیاب ہوسکیں۔

غرض اس دنیا میں انسان کو جو چیز حرکت وعمل پر آمادہ کرتی ہے وہ اس کی فکر وسوچ ہے اور فکر وسوچ کی تعمیر علم کی بنیاد پر ہوتی ہے، جانوروں کا علم حواس خمسہ تک محدود ہے، اس لیے وہ اپنی پرواز ذاتی زندگی سے آگے نہیں بڑھا پاتے ہیں، اس کی زندگی جینے کے لیے محدود غذا اور محدود خواہشات تک ہی محدود ہے، وہ انسان جس کے پاس حواس خمسہ کے علاوہ عقل کی بھی دولت ہے، لیکن وحی الٰہی سے محروم ہے، اس کی تگ ودو بھی بس اسی دنیا تک محدود ہے، وہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت اور عہدہ ومنصب یا حکومت وحکمرانی سے آگے نہیں بڑھ پاتا ہے، کیوں کہ اس کے نزدیک دنیا ہی سب کچھ ہے۔

”**إن هي إلا حياتنا الدنيا نموت ونحيا**“ (المؤمنون:۳۷) (بس زندگی تو ہماری (یہی) دنیوی زندگی ہے کہ ہم میں کوئی مرتا ہے اور کوئی پیدا ہوتا ہے۔) وہ دنیا میں مختلف قسم کے انکشافات وایجادات کرکے دنیاوی زندگی میں سہولتیں اور آرام حاصل کرنے کے ذرائع ہی کو اپنی سب سے بڑی ترقی اور کامیابی سمجھتا ہے، دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جانوروں ہی کی طرح یہ انسان اپنی دنیوی زندگی تک محدود ہے، چونکہ اس کا علم اسی دائرے میں رہتے ہوئے اس کی فکر کی تعمیر کرتا ہے اور یہ فکر اسے اسی محدود عمل پر آمادہ کرپاتی ہے، جیسے کسی بچے کو آپ کھلونا دیدیں تو وہ بس اسی کھلونے کو اپنا پورا سرمایہ سمجھتے ہوئے اسی میں لگا رہتا ہے، اس سے آگے کی اس کی سوچ وفکر نہیں رہتی ہے، بلکہ وہ کھلونا کے گم ہونے یا ٹوٹنے پر ہنگامہ کرتا ہے، روتا ہے، چلاتا ہے، وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، جبکہ بڑے اسے صرف کھلونا سمجھتے ہیں، اور ان کی نگاہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے، بالکل یہی صورتِ حال ایسے لوگوں کی ہے جن کا علم اسی دنیاوی ساز وسامان، مال ومتاع اور عہدہ وحیثیت تک محدود ہے، قرآن کریم نے بھی اس طرف اشارہ کرتے ہوئے دنیا اور دنیا کی زندگی کو لہو ولعب قرار دیا ہے، ارشاد ہے۔ ”**وما الحيوة الدنيا إلا لعب ولهو**“ (الانعام:۳۲) (اور دنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں بجز کھیل تماشے کے) چنانچہ بچہ جس طرح اپنی محدود فکر کی وجہ سے کھلونا سے باہر اور اوپر نہیں آپاتا ہے، ویسے ہی یہ لوگ جن کا علم صرف دنیوی زندگی تک محدود ہے، وہ آگے اور اس سے اوپر مستقبل کے بارے میں نہیں سوچ سکتے ہیں، قرآن نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا۔

''یعلمون ظاھرا من الحیاۃ الدنیا و ھم عن الآخرۃ ھم غافلون ''(الروم:۷) یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے (محض) بے خبر ہیں۔ بلکہ آخرت کے سلسلے میں ان کے علم کے بارے میں قرآن نے یہاں تک کہہ دیا۔ ''بل ادارک علمھم فی الآخرۃ بل ھم فی شک منھا بل ھم منھاعمون '' (النمل:۶۶) (بات یہ ہے کہ آخرت کے باب میں ان کا علم نیست ہو چکا بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں، بلکہ یہ اس کی طرف سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔) جبکہ ایک مؤمن کا علم اس کے حواس خمسہ اور عقل وشعور کے علاوہ وحی سے بھی مستفاد ہوتا ہے، چنانچہ اس کا دائرۂ کار اس دنیا کے ساتھ اس کے بعد کی دنیا بھی ہے اور وہ ان تینوں ذرائعِ معلومات سے کام لیتے ہوئے اپنی ذات کے ساتھ اپنے خاندان، پڑوس، ملک اور پوری دنیا اور اس دنیا سے جانے کے بعد کی بھی فکر رکھتا ہے اور یہی فکر اس کو ان تمام امور کے لیے متحرک وفعال بنائے رکھتی ہے، چنانچہ وہ اس دنیا کو اسی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اس سے استفادہ کرتا ہے اور اصل زندگی آخرت کی طرف اسی کی پوری توجہ رہتی ہے۔''قل متاع الدنیا قلیل والآخرۃ خیر لمن اتقی ''(النساء:۷۷) (آپ کہہ دیجئے کہ دنیا کا سامان (بہت ہی) تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لیے کہیں بہتر ہے جو تقوی (اختیار) کرے۔) غرض عمل کی بنیاد فکر بنتی ہے اور فکر کی بنیاد علم ہے، اس لیے اس علم کی بڑی اہمیت ہے، موجودہ دور میں انسانوں نے اس کی قدر وقیمت کو مزید اجاگر کیا ہے، لیکن اپنے محدود دائرے میں، جبکہ ربِ کائنات نے اس دنیا میں انسان کو بھیجنے کے ساتھ ہی علم کو اس کی زندگی کا جزو لاینفک قرار دیا، ارشاد باری ہے۔''علّم آدم الاسماء کلھا ''(البقرہ:۳۱) (اور اللہ نے آدم کو نام سکھلا دیئے کل کے کل) یہ علم بنی نوع انسان کو اس کی تمام دنیوی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے قیامت تک کے لیے عطا فرمادیا گیا اور اسی علم کی بنیاد پر انسانوں کو فرشتوں سے بھی افضل بنادیا، اس علم میں وہ تمام وسائل معلومات شامل ہیں، جن کے ذریعہ انسان اپنی دنیوی ودینی ترقی کے بامِ عروج پر پہنچ سکتا ہے۔

علم کی اسی انسانی ضرورت کے پیشِ نظر اللہ تعالی نے سب سے افضل انسان پر پوری کائنات کی ہدایت کے لیے جب وحی نازل فرمائی تو سب سے پہلی وحی علم ہی کے تعلق سے نازل فرمائی اور حکم ہوا''اقرأ باسم ربك الذی خلق '' (العلق:۱) (آپ پڑھیے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا کیا ہے) یہاں اللہ تعالی نے اپنے ناموں وصفات میں سے''رب'' لاکر یہ بتادیا کہ پوری کائنات کا نظام چلانے والا، انسانوں کی تمام ضروریات کی کفالت کرنے والا، اسے نیست سے ہست میں لانے والا اور اس کی ہر چیز کی نگہداشت کرنے والا تنہا وہی ہے، اس لیے تمام علوم چاہے وہ اس دنیا میں دینی علوم سے موسوم ہوں یا عصری علوم سے سب کا سرچشمہ بھی وہی ذات ہے اور اسی کے نام کی برکت سے انسان اپنی معلومات وعلم میں ترقی کرسکتا ہے۔اور آج کی اصطلاح میں خالص دنیوی علوم کو بھی اس کے نام کے ساتھ جوڑ کر آخرت میں کامیابی وکامرانی بلکہ ترقی درجات کا زینہ اور عند اللہ مقبولیت کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔

اس وقت دنیا میں جو نظامِ تعلیم رائج ہے، بلا شبہہ اس سے بھی فکر کی تعمیر ہو رہی ہے اور وہ بھی عمل پر ابھار رہا ہے،

مگر کس طرح کی فکر کی تعمیر ہورہی ہے اور کس عمل پر انسان کی توجہ مرکوز ہے اور دنیا والوں نے علم کو کس کام کے لیے استعمال کرنا شروع کردیا ہے اور ان اسکولوں و کالجوں کے ذریعہ وہ کس فکر کی تعمیر کرکے انسان کو کس عمل پر ابھار رہے ہیں، خود اس ملک میں انگریزوں نے کالج قائم کرکے یہاں کے باشندوں کے اندر کیسی فکر پیدا کردی اور ان کے عمل و کردار کو کس رخ پر ڈال دیا، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں، بس یہ سمجھئے کہ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو بلاشبہہ انسان اپنی معلومات و علم جو حواس خمسہ اور عقل پر مبنی ہے کے ذریعہ اس دنیا کی راحت وسکون اور اس کی ہر نعمت کو حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں پوری دنیا کو اپنے قابو میں کرنے کی جدوجہد میں لگا ہوا ہے، وہ دراصل اس دنیا کو تباہی کی طرف لے جارہا ہے، جو خود اس کی خودکشی کا سبب بنتا جارہا ہے۔ ع

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس دور میں تعلیم کو حصولِ زر کا ذریعہ بنالیا گیا ہے، اسے روحانیت کا سرچشمہ بنانے کی فکر نہیں کی گئی۔ اسے دماغی ورزش قرار دیا گیا، دلوں کے دروازے اس کے لیے بند کردیئے گیے، تعلیم سے دماغ روشن ہوئے، دلوں کے نہاں خانے منور نہیں ہوسکے، آنکھیں خیرہ ہوئیں، سینے کشادہ نہیں ہوسکے، خارجی تصورات کے مقاصد حاصل ہوئے، معرفت کے داخلی تاثرات مادیت کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہے، انسانیت کا قافلہ راہوں میں دوڑتا رہا، منزل سے ہمکنار ہونے کی سعادت اسے نہیں مل سکی۔ یورپ کی روشنی علم و ہنر کو دیکھ کر اقبال نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ''بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات۔'' (تکبیر مسلسل: ۶۴۲-۶۴۳)

ان حالات میں قرآن کریم کی پہلی وحی اور اس نظریے کے تحت قائم ہونے والے ادارے و مدارس جس کی ابتداء دارارقم، صفہ مسجد نبوی اور مسجد حرام سے لے کر دنیا کے چپے چپے میں پھیلے ہوئے نظامِ تعلیم کے مدارس ہی تمام انسانوں اور پوری دنیا کو اپنے علمی، فکری اور عملی کردار کے ذریعہ نجات دلاسکتے ہیں، حضرت مولانا رحمہ اللہ جو صرف ایک مؤرخ و ادیب ہی نہیں تھے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انہوں نے موجودہ دنیا کو بہت قریب سے دیکھا تھا، وہ مغرب و مشرق کے میخانوں سے واقف تھے، انہیں دنیا کی بڑی بڑی یونیورسیٹیوں، جامعات اور کالجوں کو اندر سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تھا، ساتھ ہی وہ چھوٹے بڑے مدارس و مکاتب کے سرپرست و ذمہ دار بھی تھے، ان سب کے ساتھ اللہ تعالی نے انہیں ایمانی فراست اور دینی بصیرت عطا فرمائی تھی، جس کی بنیاد پر وہ موجودہ دور میں بھی انہیں مدارس کو جبکہ وہ اپنی اصلی شکل اور اپنے اصل مقاصد سے وابستہ ہوں، پوری انسانیت کے لیے نجات دہندہ اور پوری دنیا کے مسائل و مشکلات کا حل قرار دیتے ہیں، اس لیے وہ ان مدارس کے تئیں بڑے فکرمند رہتے تھے اور ان کو ان کی حیثیت و اہمیت یاد دلاتے رہتے، اس کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں رہتے، وہ مدارس کو پوری انسانیت اور پوری دنیا کی صلاح و فلاح کا مرکز مانتے تھے۔ حضرت مولانا رحمہ اللہ نے مدارس کی اس حیثیت و اہمیت کو دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے سامنے واضح کرتے ہوئے ۱۹۵۴ء میں فرمایا تھا:

''دوستو! ہم کو سب سے پہلے معلوم ہونا چاہئے کہ

ایک دینی مدرسہ کا مقام اور منصب کیا ہے؟ مدرسہ کیا ہے؟ مدرسہ سب سے بڑی کارگاہ ہے، جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں۔ مدرسہ عالمِ اسلام کا بجلی گھر (پاور ہاؤس) ہے، جہاں سے اسلامی آبادی بلکہ انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے، مدرسہ وہ کارخانہ ہے، جہاں قلب ونگاہ اور ذہن ودماغ ڈھلتے ہیں، مدرسہ وہ مقام ہے، جہاں سے پوری کائنات کا احتساب ہوتا ہے اور پوری انسانی زندگی کی نگرانی کی جاتی ہے، جہاں کا فرمان پورے عالم پر نافذ ہے، عالم کا فرمان اس پر نافذ نہیں، مدرسہ کا تعلق کسی تقویم، کسی تمدن، کسی عہد، کسی کلچر، زبان وادب سے نہیں کہ اس کی قدامت کا شبہ اور اس کے زوال کا خطرہ ہو، اس کا تعلق براہ راست نبوتِ محمدی ﷺ سے ہے، جو عالمگیر بھی ہے اور زندہ وجاوید بھی، اس کا تعلق اس انسانیت سے ہے جو ہر دم جواں ہے، اس زندگی سے ہے جو ہمہ وقت رواں اور دواں ہے، مدرسہ درحقیقت قدیم وجدید کی بحثوں سے بالاتر ہے، وہ تو ایسی جگہ ہے، جہاں نبوتِ محمدی کی ابدیت اور زندگی کا نمو اور حرکت دونوں پائے جاتے ہیں۔'' (میر کارواں: ۱۷۱-۱۷۲)

اسی فکر کو ایک دوسرے موقع پر یوں فرمایا:

''حضرات! صحیح دینی مدرسے کے بارے میں میرا نقطۂ نظر بہت سے بھائیوں سے اور ان پڑھے لکھے دوستوں سے مختلف ہے، جو مدرسوں سے واقفیت کا دعوی رکھتے ہیں، یا اس سے تعلقات رکھتے ہیں، میں مدرسہ کو پڑھنے پڑھانے اور پڑھا لکھا انسان بنانے کا کارخانہ نہیں سمجھتا، میں مدرسہ کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں، میں اس سطح پر آنے کو تیار نہیں ہوں کہ مدرسہ اسی طریقہ سے پڑھنا لکھنا سکھانے یا یوں کہنا چاہئے کہ پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کا ایک مرکز ہے، جیسے کہ دوسرے اسکول اور کالج ہیں، میں اس کو مدرسہ کے لیے ازالۂ حیثیتِ عرفی کے مرادف سمجھتا ہوں، یعنی اگر میں مدرسہ کا وکیل ہوں یا میں خود مدرسہ بن جاؤں تو میں اس پر ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ قائم کرسکتا ہوں، اگر کوئی مدرسہ کو صرف اتنا حق دینے اور مدرسہ کو صرف اتنا ماننے کے لیے تیار ہے کہ ''صاحب! جیسے پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کے لیے بہت سے کارخانے ہیں، بہت سے مرکز ہیں، کوئی اسکول کہلاتے ہیں، کوئی کالج کہلاتے ہیں، ان کے مختلف معیار اور مختلف سطحیں ہیں، اسی طریقہ سے مدرسہ بھی عربی زبان یا عربی فنون، فقہ اور دینیات، تفسیر وحدیث سکھانے کا ایک مرکز یا ایک کارخانہ ہے، میں مدرسہ کو نائبینِ رسول وخلافت الٰہی کا فرض انجام دینے والے اور انسانیت کو ہدایت کا پیغام دینے والے اور انسانیت کو اپنا تحفظ وبقاء کا راستہ دکھانے والے افراد پیدا کرنے والوں کا ایک مرکز سمجھتا ہوں، میں مدرسہ کو آدم گری اور مردم سازی کا ایک کارخانہ سمجھتا ہوں۔'' (میر کارواں: ۱۷۲-۱۷۳)

ان اقتباسات کو نقل کرنے کے بعد حضرت مولانا عبد اللہ عباس ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مذکورہ بالا اقتباسات سے صرف یہ پہلو نمایاں کرنا تھا کہ مولانا مدرسے کو کس عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، مدرسہ جس کو عرب ''مصنع الرجال'' کہتے ہیں یعنی انسان سازی کا کارخانہ، یہ مولانا کے ذہن میں آج سے نہیں بلکہ ابتدائے نوعمری سے رہا اور اس نے ایک عقیدے اور یقین کی شکل اختیار کرلی، جو لوگ مدرسوں کی

تحقیر کرتے ہیں اور اس کو ایک کاروباری نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، ان کے لیے مولانا کے احساسات، تصحیح فکر کا ذریعہ ہوگا، اہل ثروت جو اپنے مال کا میل کچیل (زکوۃ، صدقہ وغیرہ) دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اسلام پر کوئی احسان کر دیا اور دین کا حق ادا کر دیا، وہ لوگ درحقیقت مدرسوں کی عظمت سے واقف نہیں ہیں، غلام ملک میں اور دشمنوں کی یلغار اور اپنوں کی تحقیر کو دیکھتے ہوئے مدرسے کو جرأت وصراحت کے ساتھ پیش کرنا، اور اس کو اسلامی عظمت کا مینار بتانا مولانا کی اہم خصوصیات میں قابل ذکر ہے۔'' (میر کارواں:۱۷۶)

مدارسِ اسلامیہ کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا رحمہ اللہ نے طلبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء کے سامنے فرمایا: ''میں کسی بھی مدرسہ کی یہ تعریف ماننے کے لیے ہر گز تیار نہیں کہ جہاں ایسی زبان سکھائی جاتی ہے، جس کی بدولت عربی کتابیں پڑھی جاسکیں، اور اس سے دوسرے دنیاوی فائدے اٹھائے جاسکیں، عربی مدرسہ کی ہر گز ہر گز یہ تعریف نہیں، بلکہ وہ تو وہ جگہ ہے جہاں طالبِ علم کے درمیان جیسا کہ میں نے پہلے کہا، اور اللہ کے درمیان ایک بلاواسطہ کی کڑی ہے، جس کا ایک سرا ادھر ہے اور دوسرا سرا اللہ کے قبضہ میں ہے۔'' (پاجا سراغ زندگی:۲۸)

حضرت مولانا رحمہ اللہ چاہتے تھے کہ مدرسہ ہمیشہ اپنی ہی ڈگر پر قائم رہے اور اپنے ہی مقاصد میں لگا رہے، مدارس سے فیضیاب ہونے والے طلبہ کسی اور راستہ پر نہ جائیں اور نہ کسی اور ڈگر کو اختیار کریں، چنانچہ انہوں نے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''آخر میں میں اس امر کو پھر صاف صاف بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ اپنی تعلیم شروع کرنے سے پہلے، اپنے مقاصد اور اپنے مقام کو پہچانو، پڑھنا اور استعداد پیدا کرنا ہی صرف اپنا مقصود ونصب العین بناؤ، اس کے علاوہ کسی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو، انشاء اللہ دنیا میں بھی کامیاب وبامراد ہوگے، کامیابی وشادمانی تمہارے قدم چومے گی اور پھر اللہ رب العزت کے حضور میں حاضری کے وقت بھی سرخ رو ہوگے، اللہ آپ کو کامیاب کرے۔'' پاجا سراغ زندگی:۲۹-۳۰)

حضرت مولانا رحمہ اللہ مدارسِ اسلامیہ کو کس نگاہ اور کس حیثیت سے دیکھتے تھے اور ان کو کتنا طاقتور سمجھتے تھے، اس کا اندازہ حضرت مولانا رحمہ اللہ کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے، بقول حضرت مولانا محمد الحسنی رحمہ اللہ ''جو مدرسہ کا سب سے شاندار اور جاندار تعارف بلکہ شائد سب سے بڑا اخراج ہے، جو اس کو اس زمانہ میں پیش کیا گیا'' (پاجا سراغ زندگی:۱۱) چنانچہ حضرت مولانا دار العلوم دیوبند کے طلبہ کے سامنے مدرسہ کی حیثیت وحقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

میں مدرسہ کو ہر ادارہ سے بڑھ کر مستحکم، طاقت ور، زندگی کی صلاحیت رکھنے والا، اور حرکت ونمو سے لبریز سمجھتا ہوں، اس کا ایک سرا نبوتِ محمدی سے ملا ہوا ہے، دوسرا اس زندگی سے، وہ نبوتِ محمدی کے چشمۂ حیواں سے پانی لیتا ہے اور زندگی کی ان کشت زاروں میں ڈالتا ہے، وہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کے کھیت سوکھ جائیں اور انسانیت مرجھانے لگے، نہ نبوتِ محمدی کا دریا پایاب ہونے والا ہے نہ انسانیت کی پیاس بجھنے والی ہے، نہ نبوتِ محمدی کے چشمۂ فیض سے بخل اور انکار ہے، نہ انسانیت کے کاسۂ گدائی کی طرف سے استغنا کا اظہار، ادھر سے إنما أنا قاسم واللہ یعطی کی صدائے مکرر ہے، تو

ادھر سے ھل من مزید کی فغانِ مسلسل۔ مدرسے سے بڑھ کر دنیا میں کون سا زندہ متحرک اور مصروف ادارہ ہوسکتا ہے، زندگی کے مسائل بے شمار، زندگی کے تغیرات بے شمار، زندگی کی ضرورتیں بے شمار، زندگی کی لغزشیں بے شمار، زندگی کے فریب بے شمار، زندگی کے رہزن بے شمار، زندگی کی تمنائیں بے شمار، زندگی کے حوصلے بے شمار، مدرسے نے جب زندگی کی رہنمائی اور دستگیری کا ذمہ لیا تو اسے اب فرصت کہاں؟ دنیا میں ہر ادارے، ہر مرکز، ہر فرد کو راحت اور فراغت کا حق ہے، اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے، مگر مدرسے کو چھٹی نہیں، دنیا میں ہر مسافر کے لیے آرام ہے، لیکن اس مسافر کے لیے راحت حرام ہے۔'' (پاجا سراغ زندگی:۹۱)

حضرت رحمہ اللہ نے مدرسے کی نسبت اور اس کے نسب نامے کو مسجدِ نبوی اور صفہ سے جوڑتے ہوئے فرمایا:

''پہلے مدرسے کی بنیاد مسجدِ نبوی میں رکھی گئی اور اس مدرسے کا نام صفہ تھا، آپ مجھے معاف کریں، میں مدرسوں میں صحیح النسب مدرسہ اور عالی نسب مدرسہ اسی کو سمجھتا ہوں جس کا شجرۂ نسب صفۂ نبوی پر جا کر ختم ہو اور میں اسی مسجد کو صحیح النسب مسجد سمجھتا ہوں جس کا شجرۂ نسب کعبۂ ابراہیمی پر جا کر ختم ہو اور مسجدِ نبوی پر ختم ہو، میں اس کے مقابلے میں دوسرے الفاظ بولنا نہیں چاہتا کہ وہ مسجد کیا کہلائے گی؟ لیکن قرآنِ مجید نے بتادیا ہے، ہمیں اور آپ کو کوئی نیا لقب ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں، وہ مسجد مسجدِ ضرار کہلائے گی، جس کا شجرۂ نسب ابراہیم ومحمد علیہما السلام کی بنائی ہوئی مسجدوں پر ختم نہیں ہوتا۔ اور وہ مدرسہ مدرسہ نہیں بلکہ انسانیت کی قتل گاہ کہلائے گا، جس کا شجرۂ نسب صفۂ نبوی پر ختم نہیں ہوتا، مسجدِ نبوی پر ختم نہیں ہوتا، ابو ذر، وسلمانؓ پر ختم نہیں ہوتا، صدیقؓ وعلیؓ پر ختم نہیں ہوتا، زیدؓ اور سیدہ عائشہؓ پر ختم نہیں ہوتا۔ ان مبلغان دین، ان ہادیانِ انسانیت، ان پیشوایانِ عالم پر ختم نہیں ہوتا، جنہوں نے ہدایت کا پیغام دیا، جنہوں نے قربانی کا پیغام دیا، جنہوں نے خود نقصان اٹھا کر دوسروں کو نفع پہنچانے کا پیغام دیا کہ اپنا زیاں مقصود ہے، اور اپنا زیاں گوارہ ہے، لیکن دوسروں کا زیاں گوارہ نہیں، جنہوں نے یہ پیغام دیا کہ اپنے گھر میں اندھیرا رکھ کر دوسروں کے گھروں میں روشنی کا انتظام کرو، اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر (اس لیے کہ ان کا سلسلہ انہیں پر ختم ہوتا ہے، جنہوں نے غزوۂ خندق میں پیٹ پر دو دو پتھر باندھے تھے) دوسروں کے بچوں کا پیٹ بھرنے اور ان کو کھلانے کا انتظام کرو، جنہوں نے یہ پیغام دیا کہ مدرسہ کا کام ملازمت دلانا نہیں ہے، مدرسہ کا کام آسامیاں بانٹنا نہیں ہے، مدرسہ کا کام ایسا پڑھا لکھا انسان بنانا جو اپنی چرب زبانی سے لوگوں کو مسحور کر لے نہیں ہے، مدرسہ کا کام قرآن سنانا ہے، جبکہ دنیا میں ہر حقیقت کا انکار کیا جارہا ہو اور یہ کہا جارہا ہو کہ سوائے طاقت کے کوئی حقیقت ہے ہی نہیں، جب دنیا میں بلا محابہ ڈنکے کی چوٹ پر کہا جارہا ہو کہ دنیا میں صرف ایک حقیقت زندہ ہے اور سب حقیقتیں مرچکیں، اخلاقیات مرچکے، صداقت مرچکی، عزت مرچکی، غیرت مرچکی، شرافت مرچکی، خودداری مرچکی، انسانیت مرچکی، صرف ایک حقیقت باقی ہے اور وہ نفع اٹھانا اور اپنا کام نکالنا ہے، وہ ہر قیمت پر عزت بیچ کر، شرافت بیچ کر، ضمیر بیچ کر، اصول بیچ کر، خودداری بیچ کر، صرف چڑھتے سورج کا پجاری بننا ہے، اس وقت مدرسہ اٹھتا ہے، اور اعلان کرتا ہے کہ انسانیت مری نہیں ہے، اس وقت مدرسہ اعلان کرتا ہے کہ نقصان میں نفع ہے،

ہار جانے میں جیت ہے، بھوک میں وہ لذت ہے جو کھانے میں نہیں، اس وقت مدرسہ یہ اعلان کرتا ہے کہ ذلت بعض مرتبہ وہ عزت ہے، جو بڑی سے بڑی عزت میں نہیں، اس قت مدرسہ اعلان کرتا ہے کہ سب سے بڑی طاقت اللہ کی طاقت ہے، سب سے بڑی صداقت حق کی صداقت ہے، یہ ہے مدرسہ کا کام اور اگر مدرسہ یہ کام چھوڑ دے اور دنیا کے سارے کام کرنے لگے تو وہ مدرسہ مدرسہ کہلانے کا مستحق نہیں۔'' (پاجا سراغ زندگی:۱۹۱-۱۹۲)

فضلاء مدارس کو خطاب کرتے ہوئے آپ نے ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں اور فرمایا: ''دوستو! آپ کا کام سب سے زیادہ نازک اور سب سے زیادہ عظیم ہے، میں نہیں جانتا کہ اس وقت دنیا کی کسی جماعت یا کسی گروہ کا کام اتنا نازک، وسیع اور اہم ہو، ان الفاظ پر دوبارہ غور کیجئے کہ آپ کا ایک سرا نبوتِ محمدی سے ملا ہوا ہے، دوسرا سرا زندگی سے، یہی آپ کے کام کی نزاکت کی وجہ اور آپ کی عظمت کی دلیل ہے، نبوتِ محمدی سے وابستگی اور اتصال جہاں ایک بڑی خوش نصیبی اور سرفرازی ہے، وہاں ایک عظیم ذمہ داری بھی ہے، آپ کے پاس حقائق اور عقائد کی سب سے بڑی دولت اور سب سے عظیم سرمایہ ہے، اس وابستگی سے آپ پر چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، آپ میں غیر متزلزل یقین اور راسخ ایمان ہونا چاہئے، آپ میں یہ حوصلہ اور ہمت ہونی چاہئے کہ ساری دنیا ملتی ہو، تو اس کے ایک نقطے سے بھی دستبردار ہونے کے سوال پر غور نہ کرسکیں، آپ کے دلوں میں اس کی حمایت ونصرت کا جذبہ موجزن ہونا چاہئے، آپ کا دل اس بے بدل دولت پر فخر اور شکر سے لبریز ہو، آپ کو اس کی صداقت، اس کی معقولیت، اس کی ابدیت، اس کی ہر زمانے میں صلاحیت، اس کی بلندی وبرتری، اور اس کی معصومیت پر غیر متبدل یقین ہو، آپ اس کے مقابل ہر چیز کو پورے اطمینان کے ساتھ جاہلیت، اور جاہلیت کی میراث سمجھتے ہوں، آپ جہاں احکامِ خداوندی اور تعلیماتِ اسلامی کو سن کر سمعنا و اطعنا کہیں، وہاں جاہلیت کے نظام اور جاہلیت کے علمبرداروں کو مخاطب کرکے کہیں کہ **کفرنا بکم وبدا بیننا و بینکم العداوۃ والبغضاء ابدا حتی تؤمنوا باللہ وحدہ** '' آپ اسلام ہی کی رہنمائی اور اسوۂ محمدی ہی کی روشنی میں دنیا کی نجات کا یقین رکھتے ہوں، اور آپ کا اس پر عقیدہ ہو کہ اس طوفانِ نوح میں سفینۂ نوح صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور امامت ہے۔'' (پاجا سراغ زندگی:۹۲-۹۳)

آج کے موجودہ حالات میں خصوصاً اپنے ملک ہندوستان کے بدلتے ہوئے مزاج واحوال میں ہمیں جہاں بہت سے کام کرنے ہیں اور اپنے دین کی بقا وتحفظ کے لیے اپنے ایمان کی سلامتی اور خود اس ملک کے امن وامان کے لیے جو قدم اٹھانے ہیں ان میں بہت اہم ان مدارس کی اصلاح، ان کے مقاصد سے مکمل ہم آہنگی اور دوسروں کے مقابلے میں ہر طرح کی زیادہ محنت وجد وجہد جو اس کی بقاء وتحفظ کے لیے ضروری ہیں، کرنا ہے، حضرت مولانا رحمہ اللہ نے طلبۂ مدارس کو اس کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا: ''عزیزو! اس عہدِ انقلاب میں دین کی نمائندگی، تعلیماتِ اسلام کی ترجمانی اور نہ صرف ان کی تشریح وتفہیم بلکہ ان کی بلندی وبرتری کا نقش قائم کرنے کے لیے بڑی وسیع تیاریوں اور بڑی متنوع صلاحیتوں کی ضرورت ہے، آپ اسلام کے سپاہی ہیں، اور زندگی کے

معرکے کے لیے تیار ہورہے ہیں، کسی فوجی تربیت گاہ اور وہاں کی تیار ہونے والی فوج کے لیے سب سے زیادہ ناموزوں سب سے زیادہ خطرناک بحث، قدیم وجدید اسلحہ اور طریقِ جنگ کی بحث ہے، سپاہی کے لیے نہ کوئی ہتھیار قدیم ہے نہ جدید، اس کو تو یہ دیکھنا ہے کہ میدانِ جنگ کے لیے کون سا ہتھیار کارگر ہے، اور کون سا طریقِ جنگ موزوں، تیار ہونے والے سپاہی کے لیے تعصب کی کوئی گنجائش نہیں، اس کا نہ کسی خاص اسلحہ سے رشتہ ہے نہ کسی خاص فنِ جنگ سے، اس کو تو تمام ضروری اسلحے سے مسلح ہونا چاہئے، عرب شاعر نے بہت پہلے کہا تھا:

کل امرئ یسعی إلی یوم الهیاج بما استعدا

(پاجا سراغ زندگی:۱۱۳)

اسی کے ساتھ اپنے ملک کی بہی وخیر خواہی، یہاں کے رہنے والوں کے ساتھ بھائی چارگی ومحبت، یہاں کی آئندہ اور موجودہ نوجوان نسل کی صحیح تربیت، ملک سے اس کی محبت، ملک کی ترقی وکامیابی کے لیے ہر طرح کی قربانی جو خود اس ملک کی مٹی میں موجود ہے اور جسے صرف ہل چلا کر نرم کرنے کی ضرورت ہے۔ ''ذرا نرم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی''

حضرت مولانا رحمہ اللہ کے ہی ایک اقتباس پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں، جو اس ملک کے تعلیمی اداروں کے نصابِ تعلیم سے متعلق کہی گئی ہے، جس تعلیم کے اثرات ہماری فکر اور ذہن ودماغ پر پڑتے ہیں اور پھر عمل کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں، جس پر عمل کر کے آج بھی ہم اس ملک کی تقدیر کو سنوار سکتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں: ''حقیقت یہ ہے کہ اگر دبے ہوئے جارحانہ مذہبی وتہذیبی جذبات وافکار سے آزاد ہوکر یہ کام ماہرینِ تعلیم کے سپرد کیا جائے تو ہندوستان کی تاریخ میں ہماری مشترکہ تہذیب اور مذاہب کی اخلاقی تعلیم میں اتنا سامان موجود ہے کہ اس سیکولر ملک کے لیے بہت آسانی کے ساتھ ایسا نصاب تیار کیا جاسکتا ہے، جو اپنی علمی وفنی خوبیوں کے ساتھ مؤثر ودل آویز ہو اور جس میں سیرت وکردار کی تشکیل کی صلاحیت بھی ہو اور جو ایک ایسی ہندوستانی نسل کے پیدا کرنے اور پروان چڑھانے میں سب سے زیادہ معاون ثابت ہو، جو ایک دوسرے سے مل کر رہنے، ایک دوسرے سے محبت کرنے، بدلتے ہوئے زمانہ کا ساتھ دینے اور اپنے ماضی وحال میں ربط پیدا کرنے اور اپنے تہذیبی سرمایے میں سے صالح ونافع چیز کے انتخاب کرنے کی لیاقت وقابلیت رکھتی ہو اور کسی بے جا چیز پر ضد کرنے، کسی ناممکن چیز پر وقت ضائع کرنے، دوسروں کو حقارت ونفرت کی نظر سے دیکھنے، تنگ ومحدود نسل پرستی اور مردم آزاری وآدم بیزاری کے عیب سے پاک ہو، جو انسان سے بحیثیت انسان کے محبت اور اس کی عزت کرنا جانتی ہو اور اس کی زندگی کو ہر مقدس جانور، ہر مقدس درخت اور مقدس دریا سے زیادہ عزیز اور مقدم سمجھتی ہو، جو کسی حقیر مقصد کے لیے انسان کا خون بہانا اور اس کا گھر پھونکنا مہاپاپ جانتی ہو، ہم کو اگر اپنا ملک اور اس کا مستقبل عزیز ہے تو ایک لمحہ کے لیے ایسی مبارک نسل کے پیدا کرنے میں دریغ نہیں کرنا چاہئے اور اس کے لیے ایسا نصابِ تعلیم بنانے کے لیے وہ تمام وسائل اختیار کرنے چاہئیں جو ہماری دسترس میں ہیں، یہ نسل ہندوستان کے لیے بھی عزت وقوت کا سرچشمہ ہوگی اور دنیا کے لیے بھی فرشتۂ رحمت ثابت ہوگی، دنیا کی نگاہیں ایسی ہی نسل اور مردانِ کار پر لگی ہوئی ہیں۔'' (تکبیر مسلسل:۲۲۸) ☆☆☆

جلیل القدر مربی — واضح رشید ندویؒ

پروفیسر شفیق احمد خان ندوی
سابق صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
shafiqnadwi@gmail.com

عربی زبان و ادب کے نامور استاذ، مایۂ ناز ادیب، بصیرت افروز ناقد اور جلیل القدر مربی مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی ۱۶؍جنوری ۲۰۱۹ء کو ۸۵ سال کی عمر میں، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مہمان خانے میں حسبِ معمول تہجد گزاری کے بعد تلاوت قرآنِ مجید کرتے ہوئے باوضو جسمانی و روحانی طہارت کے ساتھ نمازِ فجر کی تیاری میں مصروف مؤذن کی اذان پر لبیک کہتے ہوئے اپنے خالق و مالک کے حضور حاضر ہوگیے؛ اور پھر اپنی جائے ولادت تکیہ رائے بریلی (یوپی) میں اپنے ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے پہلو میں ہمیشہ کے لیے محوِ استراحت بھی ہوگیے۔ قابلِ ذکر ہے کہ مولانا واضح صاحبؒ کی ولادت اسی تکیہ، رائے بریلی میں ۲۰؍نومبر ۱۹۳۳ء کو ہوئی تھی۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی صاحب رحمۃ اللہ بھی تو اسی طرح ۲۲؍رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کے آخری عشرے میں (۳۱؍دسمبر ۱۹۹۹ء) کو اسی تکیہ شاہ علم اللہ و سید احمد شہید رحمہما اللہ کے دیار میں جمعہ کی نماز کی تیاری کر کے تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے ارحم الراحمین سے جا ملے تھے۔ **اللّٰھم اغفر لھم مغفرۃ واسعۃ.**

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مولانا سید محمد واضح رشید ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے معتمدِ تعلیم تھے، عربی زبان و ادب کی فیکلٹی کے ڈین، فکرِ اسلامی کے اعلیٰ ادارے کے ڈائریکٹر، رابطہ ادبِ اسلامی عالمی کے جنرل سکریٹری، اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز کے نائب صدر، پندرہ روزہ عربی جریدہ کے چیف ایڈیٹر اور ماہنامہ البعث الاسلامی کے شریک چیف ایڈیٹر تھے اور درجنوں عربی اردو کتابوں کے مؤلف بھی تھے:

چاندنی بے نور گل بے رنگ اور نغمے اداس
اک ترے جانے سے کیا بتلاؤں کیا کیا ہوگیا

مولانا واضح صاحب نے ندوے سے فاضلِ ادب کی سند ۱۹۵۱ء میں حاصل کی تھی اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں بی اے (پرائیویٹ) پاس کیا اور آل انڈیا ریڈیو دہلی کے عربی یونٹ میں انگریزی عربی مترجم اور اناؤنسر مقرر ہوئے جہاں بیس (۲۰) سال تک مشغول

رہے۔ مولانا واضح صاحب سے راقم کا تعلق بہت پرانا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں راقم نے ندوے سے فاضلِ دینیات کی سند حاصل کر کے دہلی کا رخ کیا تھا، جہاں جامعہ ملیہ میں دو سال ہوسٹل میں رہ کر ہائر سیکنڈری اسکول پاس کیا۔ اس زمانے میں مولانا اجتباء ندوی صاحب جامعہ میں استاد تھے۔ ان کے یہاں مولانا واضح صاحب اور مولانا سید ابوبکر حسنی صاحب سے برابر ملاقات ہوتی تھی اور جب کبھی شہر جاتا، فراش خانے (محلے) میں ان کے گھر بھی جاتا، اس زمانے میں راقم نے آنے جانے والوں کے ساتھ حسنی خانوادے کی ضیافت، اخلاق اور تواضع کے مظاہر دیکھے اور متاثر ہوا۔ ایک بار ۱۹۶۸ء میں پروفیسر عبدالحلیم ندوی اور پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی نے عربی تقریروں کا ایک مسابقہ "دور الطالب فی بناء الوطن" کے نام سے کرایا، اس میں جج کے فرائض مولانا واضح رشید حسنی صاحب اور مولانا ابوبکر حسنی صاحب نے انجام دیے جو بالترتیب آل انڈیا ریڈیو میں مترجم و اناؤنسر اور نہرو انٹرنیشنل سینٹر میں استاد تھے اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے قیام کے بعد اس کے ویسٹ ایشین اسٹڈیز سینٹر میں پروفیسر ہوئے تھے۔ اس مسابقے میں مشہور شامی سفیر و شاعر عمر ابوریشہ کی صدارت میں انھیں کے بدست بحمداللہ اول انعام راقمِ سطور کو حاصل ہوا تھا، ان دونوں حسنی بزرگوں سے راقم نے نجی ملاقاتوں میں بہت کچھ سیکھا اور یہ دیکھ کر متاثر ہوا کہ ان کا گھر مدارسِ دینیہ کے چندہ مانگنے والوں کا ملجأ و مأویٰ ہے۔ ضیافت و سخاوت اور تواضع کا یہ سلسلہ مولانا ابوبکر حسنی کی وفات کے بعد بھی ان کے داماد (راقم کے ندوی کلاس فیلو دوست) خالد حسنی ندوی کے ذریعہ ایک زمانے تک جاری رہا۔

واضح صاحب صحیح معنوں میں متقی تھے، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کی صفات سے متصف متقی اور مردِ مؤمن۔ مجھے یاد ہے ۱۹۷۳ء کا زمانہ جب میں علی گڑھ میں ایم اے کا طالب علم تھا؛ اور حضرت مولانا علی میاں علیہ الرحمہ سے ملنے تکیہ گیا ہوا تھا۔ حضرت مولاناؒ کے حضور باادب بیٹھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، جستجو ہوئی کہ کون ہے؟ معلوم ہوا کہ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی صاحب ہیں جب اپنی ریڈیو کی ۲۰ رسالہ ملازمت چھوڑنے کی اجازت حضرت مولاناؒ سے طلب کر رہے ہیں اور وجہ یہ بتا رہے ہیں کہ یہاں اکثر خلافِ واقعہ باتوں کا ترجمہ کرنا پڑتا ہے اور انھیں نشر بھی کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں تو اپنے گاؤں رستہ مئوضلع رائے بریلی (جواب ضلع امیٹھی میں ہے) واپس چلا آیا۔ چند روز بعد ہی معلوم ہوا کہ مولانا واضح صاحب ریڈیو کی بڑی تنخواہ چھوڑ کر ندوہ آگیے اور مفت پڑھانے لگے، جہاں ایک عرصے کے بعد قدرِ کفاف سے بھی کم مشاہرہ دیا جانا منظور ہوا۔ میں دنگ رہ گیا؛ کہ اس زمانے میں بھی تقویٰ اور عزیمت کی راہ پر چلنے والا کوئی تو نظر آیا۔

کچھ ہی دن بعد واضح رشید حسنی کے نام سے مضامین مجلّہ "البعث الإسلامی" اور صحیفة "الرائد" میں شائع ہونے لگے، جو بعد میں "صور و أوضاع"، "أنباء و تعلیقات" اور "افتتاحیة الرائد" کے مستقل عناوین کی شکل اختیار کر کے عربی زبان کے طلبہ و اساتذہ کی توجہ اور استفادہ کے وسیلے بنتے گیے۔ مجھے واضح صاحب کی نگارشات اور ان کے اسلوبِ بیان سے خصوصی دلچسپی رہی ہے کیونکہ ان کی

تعبیرات انگریزی عربی کے قدیم وجدید اندازِ بیان اور سادگی و پرکاری کا حسین امتزاج ہوا کرتی تھیں:

سادگی و پرکاری بے خودی و ہوشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
(غالبؔ)

حسن الحضارة مجلوب بتطرية
وفي البداوة حسن غير مجلوب
(المتنبّي)

مولانا واضح صاحب نے البعث اور الرائد کے معیار کی بلندی میں اہم رول ادا کیا، حتّٰی کہ وہ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، استاذ گرامی مولانا سعید الاعظمی ندوی کا دستِ راست بن گیے؛ اسی طرح جس طرح ہوا کرتے تھے مجلة البعث الإسلامی کے مؤسس اور پہلے چیف ایڈیٹر سید محمد الحسنی مرحوم مؤلف کتاب الإسلام الممتحن۔ مجھے یاد ہے ۱۹۵۹ء کا زمانہ جب میں ندوۃ العلماء کے دوسرے درجے کا طالب علم تھا، حضرت مولانا محمد رابع حسنی اور حضرت مولانا سعید الاعظمی نے پندرہ روزہ صحیفہ ''الرائد'' نکالا۔ میں ان کے ساتھ لگا رہتا تھا اور ''الرائد'' کے بنڈل پوسٹ کرنے اکیلے ہی چار باغ لکھنؤ اسٹیشن جایا کرتا تھا۔ خریداروں کے نام پتے بھی اپنے ہاتھ سے لکھا کرتا تھا۔ قاری علیم صاحب مرحوم کی دستی کتابت سے کسی طرح بہ مشکل تمام یہ پرچہ چھپتا اور شائع ہوتا تھا۔

بارہ چودہ برس کے بعد جب مولانا واضح صاحب ریڈیو کی نوکری چھوڑ کر ندوے آئے تو ''الرائد'' کی قسمت جاگی۔ واضح صاحب نے اسے ملون رسالے کی شکل دی۔ صفحات میں اضافے کیے۔ افتتاحیہ مولانا رابع صاحب کے قلم سے اور کلمۃ العدد مولانا سعید الرحمٰن اعظمی صاحب مدظلہما کے قلم سے شائع ہوتے رہے۔ باقی دیگر مضامین اور مستقل عنوانات خصوصاً ''أنباء و تعليقات'' و''صور و أوضاع'' نئی نسل کی ہمہ گیر تربیت کا سامان فراہم کرنے لگے۔ اس طرح مولانا سید محمد واضح رشید حسنی نے سرزمین ہند کی عربی صحافت کو عالمِ عرب کے وسیع و عریض آسمانوں تک پہنچایا۔

مولانا واضح کی درج ذیل عربی وارد کتابیں موجود و میسر ہیں جن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ امتِ مسلمہ کی ہمہ گیر تربیت کے متلاشی تھے، محض تدریس اور تعلیم پر اکتفاء کرنے کے قائل نہ تھے:

(١) إلى نظام عالمي جديد (٢) من قضايا الفكر الإسلامي: الغز والفكري (٣) تاريخ الأدب العربي في العصر الجاهلي (٤) أعلام الأدب العربي في العصر الحديث (٥) مصادر الأدب العربي (٦) أدب أهل القلوب (٧) تاريخ الثقافة الإسلامية (٨) الرحلات الحجازية ومناهج كتابها في العصر الحديث (٩) أدب الصحوة الإسلامية (١٠) محمد رسول الله وصحابته رضي الله عنهم (١١) الشيخ أبوالحسن علي الحسني الندوي قائدا حكيما (١٢) ابوالحسن علي الندوي: منابع فكره ومنهجه (١٣) من صناعة الموت إلى صناعة القرارات (١٤) حركة

رسالة الإنسانية (۱۵) حركة التعليم الديني وتطور المنهج (۱۶) محسن انسانیتؐ (۱۷) سلطان ٹیپو شہید -ایک تاریخ ساز قائد (۱۸) مسئلۂ فلسطین (۱۹) ندوۃ العلماء- ایک رہنما تعلیمی مرکز اور تحریکِ اصلاح ودعوت (۲۰) نظامِ تعلیم وتربیت : اندیشے، تقاضے اور حل (۲۱) اسلام -تکمیلِ نظامِ زندگی (حدیث نبوی کی روشنی میں) (۲۲) انسانی حقوق (قرآن وحدیث اور سیرت کی روشنی میں) (۲۳) فضائل القرآن الكريم (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ) (۲۴) فضائل الصلاة على النبیؐ (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ) (۲۵) الدين والعلوم العقلية (مولانا عبدالباری ندوی کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ)۔

یہ ہے مولانا واضح صاحب کا علمی ادبی وتربیتی ورثہ جو ان شاءاللہ علمِ نافع کے طور پر صدقۂ جاریہ بن کر ان کی مغفرت اور ترقی درجات کا باعث بنے گا۔ فرمانِ رسالتؐ کے بموجب انسان کے مرنے کے بعد تین اعمال ضرور باقی رہتے ہیں: (۱) صدقۂ جاریہ (۲) علمِ نافع اور (۳) صالح دعا گو اولاد۔ بنا بریں ہم کہہ سکتے ہیں کہ موصوف مولانا محمد واضح کے چھوڑے ہوئے صدقۂ جاریہ اور عام نفع بخش کاموں کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت یافتہ صلبی اور تربوی وروحانی اولاد کا سلسلہ جاری ہے اور ان شاءاللہ ہمیشہ جاری وساری اور زندہ تابندہ ہی رہے گا۔

وہ کلاس روم کی حد تک درس وتدریس میں مشغول مدرس تو تھے ہی، درس گاہ کے حدود میں جاری مفید ونافع خصوصی و عمومی درسی وغیر درسی سرگرمیوں پر گہری نگاہ رکھنے والے معلم اور نگراں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جلیل القدر دانا وبینا مربی تھے جن کا مقصود ہمہ گیر وجامع شبانہ روز تربیت تھی، ذہنی وفکری، ادبی، ذوقی، جمالیاتی، شخصی وجسمانی، اخلاقی وروحانی تربیت اور شخصیت سازی جس کو كلية التربية Faculty of Education کا اصلی ہدف مانا جاتا ہے۔ اس طرح کی جامع تربیت کے بغیر کوئی استاذ مدرس تو ہوسکتا ہے، معلم بھی ہوسکتا ہے، مربی نہیں۔ حضرت الاستاذ مولانا واضح صاحبؒ صحیح معنوں میں مربی تھے، خاموشی، سادگی، فرض شناسی، اعتدال پسندی، خوش اخلاقی، خدا ترسی، خود احتسابی، پاکیزگی، علم وعمل کی باہمی تطبیق اور اچھے کاموں میں دوسروں کی حوصلہ افزائی جن کی بنیادی صفات تھیں۔ اس موقع پر چھوٹوں کی ہمت افزائی کا ایک واقعہ بطورِ مثال میں بیان کرنا چاہوں گا۔ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ دہلی میں حسین حسنی صاحبؒ کے گھر حضرت الاستاذ مولانا رابع صاحب مدظلہ اور مولانا واضح صاحبؒ تشریف فرما تھے۔ عصر کے بعد کی مجلس میں مولانا واضح صاحبؒ نے راقم کی طرف متوجہ ہوکر حضرت مولانا رابع صاحب دامت برکاتہم اور دیگر لوگوں کے سامنے کہا: ''شفیق! تمہاری کتاب ''العربية الوظيفية Functional Arabic'' میں نے دیکھی؛ اچھی کتاب ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ ندوہ کے طلبہ کو اس سے فائدہ کس طرح پہنچایا جائے۔'' یہ تھا ہمارے استاد کی پدرانہ شفقت وتربیت کا اندازِ کریمانہ۔

راقم آج بھی انھیں یاد کرتا ہے تو کہتا ہے:

تمھیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں کے زندہ ہو
تمھاری نیکیاں زندہ تمھاری خوبیاں باقی

کہانی

سُبک دوشی

محمود عالم قریشی

ہم سُبک دوشی کے صرف لغوی معنی سے آشنا تھے، یعنی کندھوں کا ہلکا ہو جانا، سر سے بوجھ اُتر جانا۔ مگر ملازمتِ سرکار سے ہماری اپنی سبک دوشی نے ہم پر اس کے کچھ مزید معنی و مفہوم نہ صرف ظاہر بلکہ واضح کیے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان معانی و مفاہیم میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔

ان مفاہیم و مطالب کے ظہور سے پہلے ہم ریٹائرمنٹ کے خیال ہی سے بے حد خوش تھے کہ سر سے ملازمت اور چاکری کا بوجھ اتر جائے گا، ہم آزاد اور بے فکر ہوں گے، وقت اپنے ہاتھ میں ہوگا، جیسے چاہیں گے گزاریں گے، کسی کی ماتحتی نہ ہوگی، خود اپنے حاکم ہوں گے، جب اور جس طرح چاہیں، اٹھیں بیٹھیں گے، سوئیں جاگیں گے، ہم پر کوئی قدغن نہ ہوگی۔ یہ ہمارے سہانے خواب تھے اور اب وقت آیا تھا ان کی تعبیر کا۔ سو ہم بہت خوش تھے۔ دفتر والوں نے اس خوشی میں اضافے کے لیے ہمیں الوداعی عشائیہ دیا، چند خوبصورت تحفے بھی دیئے، ہار پہنائے، ہمارا ساتھ چھوٹنے پر اظہارِ افسوس کیا اور گلے مل مل کر ہمیں رخصت کیا۔

اپنا قلم دان اپنے جانشیں کے سپرد کر کے ہم خوشیاں اور مسکراہٹیں چہرے پر سجائے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ بہت سے عزیز و اقارب جمع ہیں۔ ہم نے ہنس ہنس کر اور مسکرا مسکرا ایک ایک کو سلام کیا، حال احوال پوچھا تو ایک جوان بولے، انکل ہم تو آپ کا حال دریافت کرنے آئے ہیں۔ ہم نے کہا، برخوردار اللہ کے فضل و کرم سے ہم تو بالکل خیریت سے ہیں اور جو کرم اس نے آج ہم پر کیا ہے، اس کے لیے شکر گزاری میں ہماری گردن جھکی جا رہی ہے۔ ایک اور عزیز کی آواز ابھری، بھائی آج آپ ریٹائر ہوئے ہیں نا۔ ہم نے اثبات میں جواب دیا تو وہ پھر گویا ہوئے، ہمیں خیال تھا اس سانحے کے بعد آپ اداس اور دل گرفتہ ہوں گے چنانچہ ہم سب آپ کا دل بہلانے حاضر ہوئے ہیں۔ ہم نے عرض کیا میاں اداس یا دل گرفتہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ریٹائر تو آخر ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا، شکر ہے عزت سے یہ مرحلہ گزر گیا۔ آج ملازمت اور چاکری فوت ہوگئی اور اس کی کوکھ سے پنشن نے جنم لیا ہے۔ میں خوش ہوں بہت خوش۔ ہم نے بیگم کو پکارا، دیکھیے ہم تو پُرتکلف چائے پی کر آرہے ہیں، اب آپ ہماری اس خوشی میں ان لوگوں کو بھی شریک کرلیں اور بہت اچھی سی چائے مع لوازمات کا انتظام کریں۔ ایک پیالی کافی ہم بھی پی لیں گے۔ جب تک آپ چائے کا اہتمام کریں ہم سجدۂ شکر ادا کرلیں۔

چائے پر گفتگو ہونے لگی۔ ایک عزیز بولے دورانِ ملازمت آدمی کا ایک بندھا ٹکا نظام الاوقات ہوتا ہے، ایک

مصروفیت ہوتی ہے ۔ سبکدوش ہوتے ہی یہ سارا سلسلہ یکدم منقطع ہوجاتا ہے' آدمی کی وہ مصروفیت نہیں رہتی ۔ وہ سوچنا شروع کردیتا ہے کہ وہ بے مصرف اور ناکارہ ہوگیا ہے' اسی سوچ میں گھلنا شروع کردیتا ہے اور اکثر لوگ تو اچھے خاصے ذہنی مریض ہوجاتے ہیں ۔ ہم نے انھیں ٹوکا اور عرض کیا' آدمی کے لیے دنیا میں ملازمت ہی تو ایک مصروفیت نہیں ۔ وہ اور ہزار طرح کے کام کرسکتا ہے اور خوش اسلوبی سے وقت گزار سکتا ہے ۔ پڑھا لکھا آدمی اور کچھ نہیں تو کتابیں پڑھ کر' بچوں کو ان کی تعلیم میں مدد کرکے بھی اچھا وقت گزار سکتا ہے ۔ ہم بھی کوئی نیا مشغلہ اپنا ہی لیں گے ۔

سوچا تو ہم نے یہ تھا کہ اپنی اس فرصت کے لمحات بال بچوں میں بیٹھ کر' ہنس بول کر گزاریں گے ۔ لیکن صبح ہم حسبِ معمول تیار ہوکر دفتر کو ہولیے ۔ اول تو تنخواہ لینا تھی' دوسرے پنشن کی منظوری کا پتہ کرنا تھا کہ کب تک ہوجائے گی ۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ کام ہفتہ عشرہ میں ہوجائے گا ۔ لیکن انتظامیہ نے ہمیں ایک لمبا فارم پکڑا دیا اور حکم صادر کردیا کہ اسے مع منسلکات مکمل کرلائیں ۔ محکمانہ کاروائی کے بعد یہ فارم اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر جائے گا اور وہی ضروری کاروائی کرکے پنشن کی کتاب جاری کریں گے ۔ چلئے ہمیں آئے دن دفتر اور پھر اے جی آفس کے چکر لگانے کا بہانہ ہاتھ آیا ۔ بال بچوں میں بیٹھنے کا خواب شرمندۂ تعبیر رہا ۔ چھ ماہ کی بھاگ دوڑ اور جوتے گھسنے کے بعد پنشن کی کتاب ہاتھ آئی تو عقدہ کھلا کہ ہماری لگی بندھی ماہوار آمدنی سبکدوشی کے دن سے صرف ایک تہائی رہ گئی ۔ ہم سے اچھے تو ایرانی ہیں کہ صرف آخری تنخواہ ہی بطور پنشن دیتے ہیں ۔ آدمی کو آمدنی کے کم ہونے کا غم نہیں اٹھانا پڑتا ۔ ہم ایک فلاحی مملکت کہلا کر سبکدوش ہونے والوں کی فلاح و بہبود سے بے پرواہیں ۔

دورانِ ملازمت ہمیں بہت سی سہولتیں میسر تھیں جو سبکدوش ہوتے ہی یک قلم موقوف ہوگئیں ۔ سب سے بڑی سہولت تو اپنے اور بیوی بچوں کے مفت علاج کی تھی جو کاغذ پر اب بھی ہمیں حاصل تھی لیکن اس کا طریقۂ عمل اتنا پیچیدہ اور طویل تھا کہ انسان پکار اٹھتا ''تا تریاق از عراق آوردہ شود بیمار مردہ شود'' ۔ یہ فلاحی سہولت دیتے وقت حکومت کو وہ ضرب المثل یاد نہ رہی کہ یک پیری صد عیب ۔ اس انحطاط کی عمر اور ہزار بیماریوں کے ساتھ کون اس طویل عمل سے گزرنے کا یارا رکھتا ہے ۔ اور پھر وہ بھی یوں کہ بیشتر دوائیں پہلے اپنی جیب سے خریدو' پھر رقم کی وصولی کے لیے پاپڑ بیلو اور دفتروں کے دھکے کھاؤ ۔ ہم نے تو اس سہولت کو مرحوم گردان کر دفنا اور بھلا دیا ۔ دوسری سہولتوں کا حال بھی اسی نوعیت کا ہے ۔ تفصیل سن کر آپ کیوں بدمزہ ہوں ۔

آمدن تو ہماری پنشن کے نام پر بحکمِ سرکار کم ہوگئی لیکن اخراجاتِ زندگی کم نہ ہوئے بلکہ گرانی سے کچھ بڑھ گیے اور اس کے ساتھ سرگرانی میں بھی اضافہ ہوگیا ۔ جن سہولتوں سے ہم محروم ہوگیے تھے ان کے مصارف کا بار بھی اب ہماری گردن پر تھا ۔ محکوم سبک دوشی بارِ گردن میں اضافے کا دوسرا نام ہے ۔ اللہ بھلا کرے ہماری شریکِ حیات اور بالغ بچوں کا جنھوں نے اپنے اپنے طور پر آمدنی کے ذرائع اختیار کرکے ہماری سرگرانی کم کی ۔

دورانِ ملازمت ہم بچت کے خیال سے مقررہ حد سے کچھ زائد رقم پراویڈنٹ فنڈ میں جمع کراتے رہے تھے ۔ سبک

دوشی پر ہم مع منافع اس کی واپسی کے حق دار تھے۔ یہ عمل بھی پنشن کی منظوری سے کم طولانی نہ تھا۔ پہلی اطلاع اس ضمن میں ہمیں یہ ملی کہ ہمارا کھاتہ نامکمل ہے اور وقفوں سے اس میں کئی سال کی کٹوتی کا کوئی اندراج نہیں۔ ذمہ داری اے جی آفس کی تھی لیکن ہم پر ڈال دی گئی۔ اب یہ ہمارا کام ٹھہرا کہ گم شدہ حساب کی تفصیل لے کر اے جی آفس کی ان مختلف سیکشنوں کے چکر لگائیں جو اس مدت میں ہمارے محاسب رہے تھے اور ان سے کٹوتی کی مصدقہ تفصیل لیکر متعلقہ سیکشن کو پہنچائیں۔ کچھ مزید جوتے گھسا کر یہ عمل بھی پورا ہوا اور ہماری جمع شدہ رقم ہمیں ملی۔ ایک سکھ کا سانس آیا۔ ہم نے نہایت سنجیدگی سے بچوں کو سمجھایا اور نصیحت کی کہ پیٹ پالنے کے لیے محنت مزدوری کر لینا' ٹوکری ڈھو لینا لیکن سرکاری نوکری نہ کرنا ورنہ بڑھاپے میں خوار ہوتے اور در در کی ٹھوکریں کھاتے پھروگے۔

ہر سال حکومتی بجٹ کے ہنگامے اور اس پر اخبارات کے تند و تیز تبصرے دیکھ کر ہم سوچا کرتے تھے کہ آخر حکومت ہر سال بجٹ پیش کر کے اسمبلی کے اندر اور باہر کیوں اپنی شامت بلواتی اور جگ ہنسائی کراتی ہے' ترک کر دے بجٹ کی اس لعنت کو۔ لیکن پنشن کی آمدنی کی تفصیل جان کر ہم خود بیگم کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گیے اور اپنا ماہانہ بجٹ بنانے لگے۔ جب گھریلو ملازمہ کی تنخواہ کا مسئلہ پیش ہوا تو بیگم نے اسے فارغ کر دینے کی رائے دی۔ ہم نے کہا' پرانی خدمت گزار ہے یہ' اچھا نہیں لگتا کہ اسے جواب دیا جائے' دوسرے آپ کی عمر بھی انحطاط پذیر ہے' آپ کو ہاتھ بٹانے والا چاہئے' اتنی رقم دوسری مدوں سے نکالی جاسکتی ہے۔ وہ بولیں ''کون سی مدوں سے؟'' عرض کیا' مثلاً کل سے اخبار بند' ہم کسی لائبریری میں جا کر اخبار دیکھ لیا کریں گے۔ بجلی کا خرچ کم کریں' بچے ایک ہی کمرے میں بیٹھ کر پڑھیں' ٹی وی کم سے کم دیکھا جائے' جس کمرے میں کوئی نہ ہو وہاں کی روشنی گل کر دی جائے۔ صحن اور برآمدے میں سے صرف ایک جگہ ایک بلب جلایا جائے' اگر مزید ضرورت ہو تو کار فروخت کر دی جائے۔ پٹرول اور اس کی ٹیپ ٹاپ کا خرچ بچے اور ہم سب بسوں میں آئیں جائیں گے۔ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔

یہ حماقت تھی یا عقل مندی' اللہ جانے' ہم نے لوگوں کی طرح پنشن کمیوٹ نہ کرائی تھی ورنہ ہماری آمدن اور بھی کم ہو جاتی اور ہمیں شاید اپنے منہ کے نوالے کم کر کے بجٹ کو متوازن بنانا پڑتا۔

دورانِ ملازمت کارہائے منصبی کی زیادتی کے باعث ہمیں عدیم الفرصتی کی شکایت تھی اور اب وقت ہمارا تھا' فرصت ہی فرصت تھی۔ اب بیگم کو بھی شکایت نہیں رہی تھی کہ ہم گھر بار کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔ ہم نے فرصت کے لمحات کا خوب خوب فائدہ اٹھایا اور گھر بار کی طرف توجہ کی' شاید کچھ زیادہ ہی توجہ کی کہ دو چار دن کے اندر ہی بیوی بچوں نے ہمارے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ گھر میں آج تک حکومت ان کی تھی چنانچہ ہم حزبِ اختلاف بنا دیئے گیے اور پسپا ہونے پر مجبور کر دیئے گیے۔ ہمارے حق میں صرف ہمارا اپنا اکلوتا ووٹ تھا۔ ہوا یوں کہ جب ہم نے توجہ کی تو گھر والوں کی بہت جا و بے جا فروگزاشتیں ہماری نظر میں آئیں جن پر ہم نے فوری گرفت کی' مثلاً بعض چیزیں بکھری دیکھیں تو انھیں قرینہ سے رکھنے کی ہدایات جاری کر دیں۔ خالی کمرے میں بجلی یا پنکھا چلتا دیکھا تو ہدایت جاری کر دی کہ کمرے سے نکلتے وقت بجلی کے

بٹن بند کیے جائیں۔ آخر ایک دن بیگم سے نہ رہا گیا اور تلخ لہجہ میں بولیں ''اللہ نے آپ کو بھی ہاتھ دئے ہیں' اعتراض کرنے کے بجائے خود ذرا ہاتھ ہلا کر چیزیں سمیٹ دیں اور ٹھکانے پر رکھ دیں تو ہاتھ گھس نہیں جائیں گے'' ہم نے جواباً کچھ عرض کر کے بات بڑھانا مناسب نہ جانا اور ہتھیار ڈال دیئے۔ اپنی ہدایات پر عمل نہ ہونے پر ہم نے خاموشی اختیار کر لی کہ تیس برس سے اوپر یہی ہمارا دستور رہا تھا اور عادتِ ثانیہ بن چکا تھا۔

اگلے روز ہم نے بیٹے کو کھیل کود میں وقت ضائع کرنے پر تنبیہ کی تو وہ بھی ماں کے نقشِ قدم پر چل پڑا' حالانکہ مثل مشہور ہے کہ ''پتا پر پوت''۔ وہ بولا ''ابو صحت کے لیے کھیل کود ضروری ہے' ویسے بھی پڑھو گے لکھو گے بنو گے نواب والی بات فرسودہ ہو چکی ہے' آپ دیکھ رہے ہیں کہ لاکھوں پڑھے لکھے بے روزگار پھر رہے ہیں' جو برسرِ روزگار ہیں' ان کو جو کچھ ملتا ہے اس میں ان کا گزارہ نہیں ہوتا۔ ادھر کھلاڑی ہیں کہ ملک ملک کی سیر سرکاری خرچ پر کر رہے ہیں' میچ کھیلنے کا معقول معاوضہ لے رہے ہیں' انعام پر انعام حاصل کر رہے ہیں' ٹی وی پر آئے دن ان کے انٹرویو ہو رہے ہیں' بتائیے ان کے مقابلے میں کتنے پڑھے لکھوں اور عالموں کے انٹرویو ہوتے ہیں'' ہم نے لاجواب ہونے سے زیادہ پگڑی سنبھالنے کی غرض سے خاموشی اور پسپائی اختیار کی اور آئندہ گھریلو معاملات میں مداخلت سے توبہ کی' پیشتر اس کے کہ ہم اپنے ہی گھر میں ناپسندیدہ شخصیت قرار دے دئے جاتے۔

ہم زندگی کی گاڑی میں فاضل پرزہ نہیں بننا چاہتے تھے لہٰذا ہمیں وقت کا دوسرا مصرف تلاش کرنا پڑا۔ پہلا خیال دفتر کا آیا کہ وہ ہمارا دیرینہ رفیق تھا۔ چنانچہ ہم نے ادھر کا رخ کیا۔ وہاں پہنچے تو داخلی دروازے پر براجمان دربان نے ہماری راہ روکی۔ وہ جو ہمیشہ کھڑے ہو کر ہمیں سلیوٹ کرتا تھا' آج مزے سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا رہا۔ ہم اس عزت افزائی پر سر جھکائے استقبالیہ کی طرف گیے کہ دربان کی ہدایت تھی کہ وہاں سے اندر جانے کے لیے پاس لائیں۔ ہم مردہ قدموں سے چلتے ہوئے انتہائی تیزی سے تاریخ ماضی کے اوراق میں اتر گیے۔ یہاں ہم نے دیکھا کہ وہ حاکمِ اعلیٰ جس کے نام سے قیصر و کسری کے ایوان لرز اٹھتے تھے' دربار لگائے بیٹھا ہے۔ نہ کوئی پہرہ چوکی ہے نہ دربان' نہ استقبالیہ' جس کا جی چاہتا ہے دربار میں جا گھستا ہے' یہ تھے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔ ایک بدو ان کے دربار میں آتا ہے اور شکایت کرتا ہے کہ آپ کے فلاں گورنر نے اپنے گھر کے آگے ڈیوڑھی بنوالی ہے اور ایک دربان وہاں بیٹھا ہے' ہمیں اس سے ملنے میں دشواری ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ایک افسر کو اسی وقت حکم دیتے ہیں کہ جا کر معاملہ کی تحقیق کرے اور اگر شکایت درست ہو تو دربان کو برطرف کر دے اور ڈیوڑھی کو آگ لگا دے۔ وہ جاتا ہے' شکایت درست پاتا ہے' خلیفہ کے احکام پر عمل کرتا ہے۔ ڈیوڑھی جل رہی ہے اور گورنر دم بخود کھڑا دیکھ رہا ہے۔ خیر! ہم تاریخ کے ان اوراق میں کھوئے کھوئے استقبالیہ پر پہنچے۔ وہاں کارکن ہمیں جانتا پہچانتا تھا' مؤدب اور مجسم سوال بن کر بولا ''سر؟'' ہم نے ایک ساتھی کا نام لیا کہ ان سے ملنا ہے۔ سوال صادر ہوا ''سر! آپ نے ان سے وقت لیا ہوا ہے؟'' ہم تو یونہی منہ اٹھائے آگیے تھے لہٰذا نفی میں جواب دینا پڑا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے معنی خیز نظروں سے ہمیں دیکھا اور کہا ''سر! پھر تو آپ کو بارہ بجے تک (جب ملاقات کا وقت

شروع ہوتا ہے) انتظار کرنا پڑے گا''۔ ابھی دس بجے تھے کیا کرتے' ہم نے سبک دوشی کے ساتھ اپنے اوپر اپنے ہی دفتر کے دروازے بند پا کر پیٹھ موڑی اور آئندہ ادھر کا رخ نہ کرنے کا عہد کر کے گھر آ گیے۔

اب کیا کیا جائے؟ سوچ سوچ کر ہم نے فیصلہ کیا اور اگلے روز مرزا کے گھر جا دستک دی' مرزا کبھی ہمارے یارِ غار تھے لیکن ادھر چند برسوں سے ان سے ملاقات نہ ہوئی تھی' وہ گھر پر مل گیے' ہمیں اندر لے گیے' بیٹھک میں بٹھایا اور بیگم کو ہماری آمد کا مژدہ سنایا۔ وہاں سے ہمارے لیے سلام اور پرسشِ احوال لائے' پھر ایک دفتر کھل گیا' زمانۂ غیاب کے حالات اور گلوں شکووں کا۔ اسی دوران اندر سے پُرتکلف چائے آ گئی جس میں ہمارا پسندیدہ انڈوں کا حلوہ اور چنے کی دال کا حلوہ بھی شامل تھا۔ چائے کے ساتھ بیگم مرزا نے کہلا بھیجا کہ بھائی ابھی جایئے گا نہیں' کھانا کھا کر جائیں' پائے اور پالک کوفتے بنے ہیں۔ یہ سن کر ہماری رال ٹپکی۔ یوں بھی ہم ابھی اٹھنے کے موڈ میں نہ تھے۔ دورانِ گفتگو مرزا نے بتایا کہ اس نے کسی کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی ہے' آج چھٹی تھی تو وہ ہمیں مل گیے۔ یہ سن کر ہمیں دوسری بیٹھک تلاش کرنے کا خیال آیا۔

اگلے دن ہم خان صاحب کی طرف چل دیئے' وہ تھیلا ہاتھ میں لٹکائے راستے ہی میں مل گیے۔ معلوم ہوا سودا سلف لینے بازار جا رہے ہیں' ہم بھی ساتھ ہو لیے۔ بازار میں دو اور سبک دوش دوست مل گیے۔ وہ پکانے کو کچھ لینے آئے تھے۔ یہاں سب خان صاحب کے ساتھ ہو لیے۔ طے یہ پایا تھا کہ وہاں برج کی بازی لگے گی۔ چنانچہ خان صاحب کے دولت کدہ پر پہنچتے ہی تاش کی گڈی نکل آئی اور برج شروع ہو گئی۔ سودے کے ساتھ خان صاحب خاتونِ خانہ کو ہماری آمد کی اطلاع دے آئے تھے۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد اندر سے چائے کی سجی سجائی ٹرے آ گئی۔ خاصی پرتکلف چائے تھی' میٹھا اور نمکین دونوں قسم کے نقل تھے' پیسٹری اور پیٹیز مستزاد۔ برج کے ساتھ چائے کا دور چلتا رہا۔ کسی کو بھی وقت کا احساس نہ ہوا یہاں تک کہ اندر سے کھانا آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ دونوں اچھل کر کھڑے ہو گیے اور گھبرا کر بولے'' مارے گیے'' بیوی تو پکانے کے لیے سودے کی منتظر بیٹھی ہوگی۔ وہ کھانا کھائے بغیر چل دیئے لیکن وعدہ کر گیے کہ کل سے سودے سلف سے فارغ ہو کر روزانہ دس بجے آ جائیں گے اور پھر برج کی بازی جمے گی۔ دو چار دن یہ محفل چلی' پھر ایک روز جو ہم نے خان صاحب کو آواز دی تو اندر سے خاتونِ خانہ پوتے سے کہہ رہی تھیں'' منے کہہ دو انھیں شدید بخار چڑھا ہے' تن بدن کا ہوش نہیں''۔ ہم نے رسمی طور پر منے کی معرفت عیادت کی اور چل دیئے۔ جونہی ہم موڑ پر پہنچے تو دیکھا' دوسری طرف کے موڑ پر خان صاحب سبزی ترکاری کا تھیلا جھلاتے چلے آ رہے ہیں۔ ہم نظر بچا کر نکل گیے۔ ان کی بیگم کی بات سے ہم نے یہ نکتہ پالیا کہ یہ نشست بھی ہاتھ سے گئی۔ ملازمت کے بار سے سبک دوش ہو کر اب ہم پر وقت کا سنگین بار آن پڑا تھا۔

ناچار ہم نے بیوی بچوں سے نوک جھونک کو غنیمت جانا اور روز کی چخ چخ میں ہی عافیت جانی اور ان لوگوں کے درمیان جو ہم پر جان چھڑکتے اور واری جاتے تھے' ناپسندیدہ ساتھی بن کر نبھانا شروع کر دیا۔ ہمارے لیے یہ بھی سبک دوشی کا ایک تحفہ تھا۔

☆☆☆☆☆☆

أوراق الخريف

شعر : د. حسن الأمراني
رئيس تحرير مجلة المشكاة/المغرب

منظوم ترجمانی: رئیس الشاکری ندوی
مکتبة كلية اللغه ، ندوة العلماء

العمرُ ينتهبُ الدروبا ما قد تصرَّم لن يؤوبا

عمر سرگرمِ سفر ہے ، برق رفتاری کے ساتھ اورگزرے پل لگے ہیں،اِس جہاں میں کس کے ہاتھ!

و الشمسُ ، شمسُك يا طويل العمر ، توشك أن تغيبا

عمر لمبی ہے، مگر سورج نہ جلدی ڈوب جائے یہ بھی ہوسکتا ہے ساحل ہی پہ کشتی ڈوب جائے

و تقولُ أوراقُ الخريفِ يكادُ فرعُك أن يذوبا

زرد پتوں کا یہ کہنا دل میں الجھن ڈال دے کیا عجب ہے ، زندگی کی شاخ گردن ڈال دے

فإلامَ تُعرضُ عن حمى رب يحبُّك أن تتوبا

اُس کی چوکھٹ سے الگ کب تک رہوگے؟ سوچنا ! بابِ تابہ وا ہے، توبہ کب کروگے؟ سوچنا !

أ نسيتَ كم جادَ الإلٰهُ عليكَ؟ كم سَتَرَ العُيوبا

اپنے رب کی نعمتوں کو تم بھلا بیٹھے ہو کیا ! رکھ لیا پردہ تمہارا ، یہ کرم بھی دیکھنا !

أ نسيتَ كم كَشفَ الكروبَ و قد تجرَّعتَ الكُروبا؟

بھول بیٹھے ہو ، مصیبت آشنا تھی زندگی جو مصیبت آئی ہے تم پر ، اُسی نے دور کی

أ نسيتَ كم لَطَفَ اللطيفُ بعبده لُطفًا عجيبا ؟

تم جو بندے ہو تو وہ بھی صاحبِ لطف و نعم کچھ عجب احسان فرمائے بعنوانِ کرم

کـم خُـضُـتَ بـحـرَ الـوزرِ جهلاً　　کـم رکبـتَ بــه الـذنـوبـا ؟
اُف گناہوں کا سمندر ، جہل کی کاریگری　　اور چادر معصیت کی تم نے آخر اوڑھ لی
وَلَـكَـم شـربـتَ الإثـمَ كـأسَـا　　خِـلتهـا عسَلاً و طيبـا
جی بہت بہلایا تم نے معصیت کے جام سے　　زہر بھی تم پی گیے ہو خوبصورت نام سے
وَلَـكَـم تسـربلـتَ الخـطـايـا　　سـابـغـات مستـطيبـا
زیبِ تن تم نے کیے کتنی خطاؤں کے لباس　　عمر بھر اچھے لگے جھوٹی اداؤں کے لباس
سـوَّاكَ ربُّكَ عـاريًـا　　وكسـاكَ مـن كـرم قشيبـا
بے لباسی یاد ہوگی اُس نے جب پیدا کیا　　خوش لباسی سے تمھیں آراستہ بھی کردیا
وسـلكـتَ ليـلَ البِيـدِ　　كـالـضِّـلِّيل مـرتـجـفًـا كـئيبـا
دشت کی تاریک راتوں میں لرزتے پاؤں سے　　چل رہے تھے ، جیسے راہی راہ سے بھٹکے ہوئے
فـحبـاكَ ثـوبَ هـداية　　وسـقـاكَ مـن عـفـو ذَنـوبـا
آخرش بخشا تمھیں رُشد و ہدایت کا لباس　　پھر معافی کے پلائے ہیں، گلاسوں پر گلاس
فـأرَزْ إلـى ظـلّ ، عـلـى　　حـرِّ الهـواجـر، لـن تـخيبـا
زندگی کی دھوپ میں شفقت بھری مہتابیاں　　منہ تمھارا دیکھتی ہی رہ گئیں ناکامیاں
واهتِف : أجِـرنِـي يـا إلٰـهُ !　　فـإنَّ لـي قـلبًـا مُـنيبـا
آؤ اُس کی بے کراں رحمت کو پھر آواز دو　　ہاں مگر طاعت گزاری کا سلیقہ ساتھ ہو
ضَـمِّـدُ جِـراحًـا أحـدثـتْ　　فـي الـقـلـبِ جـمـرتُهـا نـدوبـا
مضطرب ہیں روز و شب تو لُطفِ پیہم چاہئے　　جلتے زخموں کو سکونِ جاں کا مرہم چاہئے
هـي أمتـي ... هـي أمتـي ...　　إنِّـي دَعَـوتُكَ فـاستـجيبـا
میری امت پر مرے مالک عنایت کی نظر　　یہ دعا مقبول فرما اے خدائے بحر و بر !